خواتین وحضرات آج میں ایسی معروضات پیش کرنے جارہا ہوں جو جنسیات/ مذہبیات سے متعلق نہیں ہیں پھر بھی شاید اس سے کچھ لوگ بے لطف ہو جائیں۔ اس میں چند حقائق پر سے پردہ اٹھ رہا ہے جن سے آنے والے دور کی دھندلی سی تصویر نظر آسکتی ہے اس لیے میں ابتدا ہی میں چوکس کر رہا ہوں۔ یہ بھی گذارش ہے کہ مجھے ماضی پرست نہ سمجھ لیا جائے بلکہ یہ صورتحال کا معروضی بیان ہے۔ ہاں مجھے یہ اعزاز مل رہا ہے کہ میں یہ فریضہ انجام دینے جارہا ہوں۔ اس تحریر میں کم ازکم دو حوالے پیش کروں گا وہ نثری بھی ہو سکتے ہیں اور منظوم بھی۔

اس گفتگو کا آغاز ہوتا ہے اس حقیقت سے کہ اٹھارویں صدی کے آغاز سے لے کر آئندہ پچھتر برس تک ہندوستان میں اردو زبان میں جو اُن دنوں ہندوستانی کہلاتی تھی کس نوعیت کا ادب پیدا ہو رہا تھا اور لکھا جارہا تھا۔ کچھ لوگ تو شاید نصاب کے لیے مفید ولی دکھنی (۱۷۰۷ء) کو پیش کر دیں گے جو حقائق کے بیچ میں ایک چھوٹے سے جزیرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس عہد کا حقیقی نمائندہ جعفر زٹلی ہے (۱۶۵۳ء۔۱۷۱۳ء) موصوف اتنے اہم شاعر تھے جو ہندوستان کے شہنشاہ اورنگ زیب کی شان میں قصیدہ کہتے ہیں جو نوآبادیاتی نظام کے قدم جما لینے سے پہلے تاریخ میں بہ لحاظ رقبہ اور آبادی برصغیر کی تاریخ میں سب سے بڑی سلطنت تھی۔ ظاہر ہے یہ قصیدہ صندوق میں بند کر رکھنے کی غرض سے نہیں کہا گیا تھا۔ کیونکہ آمریت اور شخصی حکومت میں صرف اسی صنف کا بول بالا ہو سکتا ہے۔ میں نے یہ تمہید یوں باندھی کیونکہ موصوف کی شاعری درباری کے ساتھ عوامی سطح کی نمائندہ سمجھی جاسکتی ہے۔ حالانکہ جعفر تر کاریوں، ظروف اہل محلّہ کی بہن بیٹیوں کے متعلق، غم روزگار اہل حرفہ اور اس دور کے نامور افراد کے متعلق اور رموز جنگ پر بھی طبع

آزمائی کرتے تھے اس کے علاوہ مچلکہ، فال، چورن، ہجو، سفارش، نکاح، تمسکات، چیٹی نامہ، عشق ومحبت اور متقی اور زاہد اورنگ زیب کے انتقال پر مرثیہ بھی لکھتے ہیں۔ (حوالہ زٹل نامہ مرتبہ رشید حسن خاں 2003 انجمن ترقی اُردو ہند، دلّی) اور نسخہ جعفر زٹلی۔ مطبع محمدی سال اشاعت ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) قصیدے کے تین اشعار سنئے سن تصنیف (۱۶۸۱) کے لگ بھگ ہے۔

(۱) زہے دھاک اورنگ زیب شاہ بلی۔۔۔ دراقلیم دکھن پڑی کھلبلی

(۴۱) چہ جھانٹ است پرتاب ابن الحمار۔۔۔ چہ لب ہلّے بینو سگ نابکار

(۶۲) رہے رات دن گانڈ کے ذکر میں۔۔۔ بہ لہو ولعب چوت کی فکر میں

ہجو عصمت النساء بیگم نواسی معمور خان مشیر عالمگیر

(۱۰) چدایا تو نے دنگل میں چھنلیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بجایا جگ میں تیں ایسا نقارا

(۱۴) بجاؤں بھوسڑی تیری کے اچھر۔۔۔ سناؤں خلق کو اے کُس پٹارا

اس کے بعد بہادر شاہ اول (۱۷۰۷/۱۷۱۲) کی ہجو میں چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ اس زمانے میں اخبارات تو شائع نہیں ہوتے تھے حزب اختلاف کے نمائندے کا بلیغ انداز بیان غور طلب ہے۔

رقم کرنے کا سال (۱۷۰۹ء) ہے۔

(۱) پان کھا کر گنڈ مروّا کھیلئے۔۔۔ باغ جا کر گنڈ مروّا کھیلئے

(۲) بادشاہی ہے بہادر شاہ کی۔۔۔ بَن بنا کر گنڈ مروّا کھیلئے

(۸) حکم قاضی محتسب زایل شدہ۔۔۔ دل بڑھا کر گنڈ مروّا کھیلئے

مقطعہ جعفر اب نوکری کا حظ نہیں۔۔۔ چت لگا کر گنڈ مروّا کھیلئے

شاعر نے اسی بادشاہ کے خلاف ایسی رباعی بھی کہی جس کے نتیجے میں قائد حزب اختلاف

پھانسی پا گیا اور ہمارے اسکول/ یونیورسٹی کے نصاب میں آج تک جگہ پانے کا منتظر ہے۔ بطور قند مکرر چاہیں تو سن لیں ع

سکہ زد از فضل حق بر سیم و زر۔۔۔ بادشاہ بحر و بر فرّخ سیر

سکہ زد از گندم و موٹھ و مٹر۔۔۔ بادشاہ تسمہ کش فرّخ سیر

بادشاہ کے تقرر نامے کی تضمین سنیئے ''جو بھر آٹا، ٹانکے بھر شکر کوڑی کا گھی میری طرف سے در ماہہ (ماہانہ تنخواہ) مقرر شدہ۔ اور کام کرے یہ کہ ہر روز پٹ پڑ گنج (تاج محل) جایا کرے اور شاہد رے آیا کرے۔ مفت کا سیدھا (Grocery) کھلایا کرے جو شہر میں رہے تو اوندھے منہ گانڈ مرایا کریے۔'' (اپائنمنٹ لیٹر) بہ دستخطِ خاص (صفحہ ۱۱۶)

چورن کا نسخہ: ترکیب ان سب بستووں (ایسی اشیا جن کا ذکر ہو مگر نایاب ہوں مثلاً چڑیا کا دودھ اور عنقا کا گوشت) کو ملا کر کھرل کرے اور ساتویں دن گولیاں بنا کر ننگی پیٹھ نہار سر باسی پانو کھائے۔ سر دکھتا ہو تو سر نہ رہے کمر دکھتی ہو تو کمر نہ رہے جو روٹی کھائے تو پیٹ میں پھنسے۔ دال خشکہ (ابلے چاول) کھائے تو نیلا ہو جائے۔ اس سے کچھ کفایت ہو تو شاباش کہے اور رحمت کہے نہیں تو تھو کے جعفر کی گانڈ میں (نسخہ چورن۔ صفحہ ۱۱۷)

اب عوامی تقریبات کی حالت ملاحظہ کی جائے۔

حیدرآباد دکن سے نواب دربار علی خان اٹھارویں صدی کے پہلے نصف میں دلّی تشریف لاتے ہیں۔

حوالہ شروع: ع آ گا بھی کھل رہا ہے، پیچھا بھی کھل رہا ہے۔۔۔ یاں یوں بھی واہ وا ہے، اور ووں بھی واہ وا ہے

آدّ بیگم کا کمال یہ ہے کہ یہ حسین ہے اور طوائف ہونے کے ساتھ ساتھ اکثر ننگی رہتی ہے اور

مجلسوں میں اکثر برہنہ آتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ جسم کے اسفل (تجابل عارفانہ دیکھئے) حصے کو بالکل عریاں کر کے اس پر پاجامے کی نقاشی کرواتی ہے۔ کمخواب کے تھان کی طرح اور بوٹے دار پایجامے کی مانند اس کے زیریں جسم پر پائجامے کی تصویر بنی ہوتی ہے جو بالکل پائجامہ معلوم ہوتی ہے۔ جب امیر بیگم امیروں کی مجلسوں میں عریاں پیجامہ پہنے ہوئے آتی ہے تو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ ننگی ہے اس راز کو اس کے مخصوص آشنا ہی جانتے۔ امیر بیگم بہت محبوب خلایق ہے۔۔۔۔۔

خواجہ حسن نظامی کی ترجمہ کردہ کتاب نادر شاہی قتل عام کی دلی۔ چونکہ وہ دلی کے روڑے اور شیدائی تھے حاشیہ لگایا کہ اس سے دلی کی مصوری کا کمال ظاہر ہوتا ہے'' حوالہ ختم۔

(نورتن صفحہ ۴۵ ۔ حوالہ شروع۔ اپنے خاوندوں، دانشمندوں کے سر پر دھڑ دھڑ اکرواتی ہیں اور کچھ نہیں ہوتا۔ مگر وہ اپنی مثل ہے۔۔۔۔ یہ سخن وہ زن پرفن سن کر خاموش ہوگئی مگر دل میں کہنے لگی کہ دیکھ تو بھڑوے تیری خبر داری اور شعور داری کیسی گانٹر کی راہ سے نکالتی ہوں۔ حوالہ ختم

تصنیف شیخ محمد بخش مہجور ۱۸۱۴ء

اب اٹھارویں صدی کے آخری عوامی/ اور خواص کے شاعر کا ذکر کرتا ہوں

ع وہ پتلے پتلے ہونت غصب وہ دانت چمکتے موتی سے۔۔۔ وہ پیٹ ملائی سا کا فر وہ ناف چمکتی تارہ سی

ملائم پیٹ مخمل سا کلی سی ناف کی صورت۔۔۔ اٹھا سینہ صفا پیڑو، عجب جوبن کی ناری ہے

(3) بقول سارتر۔ ہم صرف ان اعضا پر عاشق ہوتے ہیں جنہیں دیکھ سکتے ہیں کل کلاں معدہ اوور جگر دکھائی دینے لگیں تو ہم ان پر بھی عاشق ہونے لگیں گے۔

(4) اس کے علاوہ نظیر نے پری کا سراپا کے علاوہ اغلام بازی کو اپنی نظم گیارہ سڈھی میں بیان کیا ہے اور آو سہلی چپٹی کھیلیں ان کی بہت مشہور نظم کا مصرعہ ہے۔ غور کیجئے پیڑو اگر دکھائی دینے

لگے تو عریانی فحاشی کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔ باقی کلام نقطوں کے پردے میں اوجھل رکھا جاتا ہے۔ جس میں نامردی کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے۔ جہاں جوش جیسا بے باک شاعر شباب و شیب پر آ کر رک گیا۔

(5) اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷) سے چند برس پہلے ہی سے ہندوستانیت اور ذیلی قومیتوں نے پر پرزے نکالنے شروع کر دیے تھے اور اورنگ زیب انہیں ختم کرنے میں آخری ۲۷ برس سے لگا ہوا تھا وہ تحریک مختلف ناموں سے کہیں صوبہ داروں کی شورش کے نام سے اور کہیں بغاوت یا شیواجی کے نام سے جاری تھی، عالمگیر کے بعد تو سال میں چار مرتبہ بادشاہ بدلے۔ اس عرصے میں علما اور غیر ملکی طاقتوں کے گماشتوں نے نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی کہ وہ آئیں اور مقامی قوتوں/تہذیبوں کو کسی طرح ختم کر دیں۔ اس کے باوجود ہندوستانیت اتنا زور پکڑ چکی تھی کہ وہ کبھی مشرق میں کبھی جنوب میں سر اٹھا لیتی اس میں ان تینوں صوبوں کا ذکر ضروری ہے جہاں افیون کاشت ہوتی تھی بکسر کی جنگ (۱۷۶۴ء) کے بعد شاہ عالم ثانی نے ۲۶ لاکھ روپے کے عوض بنگال بہار اور اڑیسہ کی دیوانی ایسٹ انڈیا کو دیدی۔ یہ مشرق سے آنے والی سفید آندھی برطانوی استعمار سے جنگ ہے جو سراج الدولہ نے پلاسی پر لڑی جس میں بڑی فوج ہونے کے باوجود اسے شکست ہوئی۔ معاشی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس وقت پورے ہندوستان کی GDP دنیا کی کل اقتصادیات کی ایک چوتھائی کے برابر تھی، (بنٹنگٹن باب۔۴) اس کی مزید تصدیق یوں ہوتی ہے کہ عالمگیر کے زمانے میں سالانہ محصولات ۶۰ کروڑ روپے تھے گویا ہندوستان کی سالانہ پیداوار اٹھارویں صدی کے اوائل میں ۱۶۰ ارب روپے کے لگ بھگ تھی جبکہ ٹیکسوں کی شرح دس فیصد سے زیادہ نہ تھی۔ (اورنگ زیب عالمگیر مرتبہ مبارک علی۔ لاہور از شبلی نعمانی / جادوناتھ سرکار) چار برس کے بعد احمد شاہ دوبارہ حملہ آور ہوتا ہے یہی وہ

مقام ہے جہاں سے ہندوستان کی مجموعی خانگی پیداوار پر نوآبادیاتی نظام نے غلبہ پانا شروع کر دیا اور سال ۱۷۷۵ء آ لگتا ہے جب کاتب کی جگہ چھاپہ خانہ اور چرخے کی جگہ کپڑا بننے کی مشین کرگھا لینے لگتی ہے۔

(6) بقول مارکس جب اوزار بدلتے ہیں تو رشتے بدل جاتے ہیں۔ برطانوی نوآبادکار کو مقامی لوگوں سے رابطہ کرنے کے لیے ہندوستانی زبانیں سیکھنا تھیں اس لیے آئندہ چند برس میں لغت نویسی زور پکڑ لیتی ہے۔ وارن ہسٹنگز کلکتہ مدرسہ ۱۷۸۱ء میں قائم کرتا ہے، جوناتھن ڈنکن بنارس میں سنسکرت کا مدرسہ قائم کرتا ہے سال ہے 1792ء لارڈ ویلزلے 1800ء میں فورٹ ولیم کالج قائم کرتا ہے جس میں ڈاکٹر گلکرسٹ بھی ہاتھ بٹاتا ہے۔ ہال ھیڈ نے بڑھ کر بنگالی گرامر مرتب کر ڈالی سر ولیم جونز نے 1770ء میں فارسی کی لغت تیار کر دی۔ میکنزی نے تامل /تلگو کی لغت لکھ ڈالی۔ جبکہ سترھویں صدی کی مرتب کردہ ہندوستانی زبان کی لغت 'تحفۃ الہند' جس کا قلمی نسخہ (خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے) آج تک نہیں چھپا۔ (اورنگ زیب۔ مبارک علی)

(7) سال ۱۷۷۵ء پر میں اس لیے زور دے رہا ہوں کہ ہندوستان کا بالائی طبقہ جس میں امرا' اعیان' مرزا صاحبان، نامور شیوخ طریق، حاذق اطباء اور بالادست لوگ شامل تھے (لارڈ دڈلہوزی از جی۔ بی مالیسن ترجمہ ابن حسن)۔ سب کے سب ستنامیوں، ہنرمندوں/ دستکاروں کے طفیل ہندوستانیوں کے توانا ہونے سے سراسیمہ ہو چکے تھے انہوں نے فوراً نوآبادتی نظام کے رہنماؤں سے گٹھ جوڑ کر لیا جس کی نوعیت ایک نئی قسم کی تھی۔ بقول ہنٹنگٹن، (دی کلیش آف سویلایزیشن) مغرب جب یورپ سے نکلا تو اس کے پاس دو چیزیں تھیں یعنی '' گاڈ اور گولڈ ''

لیکن وہ قطب نما کی مدد سے نکلا تھا۔ اس کی تصدیق ایک لطیفے سے ہوتی ہے جو افریقہ میں

مشہور ہے کہ جب مشنری آئے نوان کے پاس انجیل تھی اور ہمارے پاس آراضی آج ہمارے گھر میں بائیبل رکھی ہے اور زمینیں اہل یورپ کے قبضے میں ہیں جنوب افریقہ میں آج بھی ۸۳% آراضی سفید فاموں کے قبضے میں ہے۔

(8) نوآبادتی نظام کے کرتا دھرتاؤں کا گاڈ جنس کاری کو گناہ سمجھتا ہے (برٹرینڈ رسل: میرج اینڈ مورل) تو ہمارے بالائی طبقے نے لغت سازی کے وقت اہل فرنگ کی اس طرح جی حضوری اور اعانت کی جس طرح ضیاالحق نے سعودی عرب کی مالی امداد کی توقع میں پاکستان میں راتوں رات حدود آرڈیننس نافذ کر دیا تھا۔ روزمرہ میں جنس کا جہاں جہاں ذکر آتا تھا اسے چھپایا جانے لگا یا غائب کر دیا گیا اور اگر بہت مجبوری ہوئی تو بازاری عامیانہ، فحش یا بیگماتی کہہ کر اس تخلیقی عمل کے بیان پر پردے ڈال دیے گئے۔ پسے اور کچلے ہوئے طبقے کی بالائی پرت جو عموماً مردوں پر مشتمل ہوتی ہے برہمی کے اظہار کے لیے جنسی تعلقات بیان کر دیتے ہیں جسے گالی کہا جانے لگا۔ اس میں عزائم نہیں ظاہر کیے جاتے بلکہ راز فاش کیا جاتا ہے اردو یا کسی ہندوستانی زبان میں شاید ہی کوئی ایسی گالی ہو جسے محض اور صرف عورتیں استعمال کر سکیں۔ بالائی طبقات ہندوستان میں ترکی/ایرانی اثرات کے تحت سر سے لے کر پیر تک جسم کو ڈھانپنے کے عادی اور مکلّف تھے۔ ورنہ آبادی کی اکثریت نہ تو کمروں کی عادی تھی جن کی اس لیے ضرورت پڑتی ہے کہ کیونکہ تولدو تناسل گناہ اور چوری نہیں سمجھا جاتا تھا اور نہ ہی لباس کا رواج تھا۔ ابن بطوطہ جو ہندوستان میں دس برس تک قاضی اعظم کے عہدے پر فائز رہا نہایت افسوس سے لکھتا ہے کہ اتنے اختیارات کے باوجود میں ہندوستانی عورت کو ناف سے اوپر کپڑا نہ پہنا سکا۔ یہی حال ٹیپو سلطان کا ہے جو ۱۷۹۹ء میں شہادت سے پہلے فرامین جاری کرتا رہا کہ عورتیں اپنے دھڑ اور انگ پر کپڑا ڈالے رہیں The Sword of Tipu Sultan by Bhagwan

S.Gadwani جس میں اسے کوئی کامیابی نہ ہوئی اور تاریخ سلطنت خداداد میسور از محمود خان بنگلوری (صفحہ ۵۰۵ جولائی ۱۹۳۵ء دیکھیے) یہ بات بھی غالباً اس کو کسی فرانسیسی مشیر نے سجھائی ہوگی۔ جو انگریز سے لڑنے میں اس کی مدد کر رہے تھے۔

اس لغت نویسی کے دو نقصانات ظاہر ہوئے اگرچہ زبان کی ایک تطہیری شکل محفوظ ہوتی گئی ۔پہلی تو یہ ہوئی کہ تخلیق اور اپج پر پہرہ بیٹھ گیا اور دوسرا یہ کہ عوامی بول چال کے الفاظ جو آبادی کی اکثریت بولا کرتی تھی جس میں کئی شعبوں کے بنیادی تجربات تھے یہ سرمایہ مٹھی بھر نام نہاد ماہرین لسانیات کے اجارے میں چلا گیا جن کا مقصد حیات غیر ملکی حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنا تھی۔ ان غیر ملکیوں کی نجابت کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ لیڈی چٹرلیز لَو رکو جو بیسوی صدی کی پہلی چوتھائی میں شائع ہوئی تھی اسے فحش شمار کیا گیا۔ لفظ زنا بالجبر کی ترکیب اگرچہ غلط ہے مگر ہماری تاریخی لغت میں یہ لفظ (۱۹۲۸ء) میں نمودار ہوتا ہے۔ جبکہ ہندوستان میں دادا گیری (Big Brother) نہ جانے کب سے رائج تھی۔ میر تقی میر فرنگی حکمرانوں کی زبان بولنے لگے۔ (۱۸۱۰)

ع ہے زنا و شراب بے وسواس۔۔۔ رعب کر لیجئے یہیں سے قیاس

اسی نوے برس پہلے اسی مضمون کا شعر اوپر پڑھا جا چکا ہے۔

حکم قاضی، محتسب زایل شدہ۔۔۔ دل بڑھا کر گنڈ مرو اکھیلئے

نوآبادیاتی نظام کے آنے سے پہلے سرعام جنس کاری عام بات تھی جس کی غالباً دو وجوہ ہیں اول غلامی/کنیزی یہ اتفاق نہیں ہے کہ فتاوی عالمگیری کی جدید اشاعتوں میں سے غلامی کا باب حذف کر دیا گیا ہے اور

چدایا تو نے دنگل میں چھنلیا۔۔۔ بجایا جگ میں تئیں ایسا نقارا

دوسرا سبب اہل ہند کا مختصر لباس میں رہنا تھا لباس کا تعلق رواج اور موسم سے ہوتا ہے۔ لباس اور نکاح سے نجات پائے بغیر انسان آزاد نہیں ہوسکتا۔ بقول مہیش بھٹ فی زمانہ عالمی منڈی میں کھال والی فلموں کی کھپت بیس ارب ڈالر کی ہے اور شمالی امریکہ میں پچاس لاکھ پینگدار کنبے (Swinger) نکاح بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔

ہندوستانیوں کا عمومی پہناوا لنگوٹی تھی جو انیسوی صدی میں کولھوں پر چوڑی ہوکر لنگوٹ بن گیا۔ اشرافیہ اور امرا پورا جسم ڈھانپتے تھے اور میوے اور پھل کھانے کی استطاعت رکھتے۔ جو دساور سے آتا تھا (فرانسیسی بغ نی آغ کا سفرنامہ ۱۶۵۵ء) جسے انگریز کی غلامی کے طفیل ہم لوگ ڈاکٹر برنیر کے نام سے جانتے ہیں۔

(10) اس مختصر طبقے نے اپنی بالادستی کی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے ہندوستانی زبان میں مقامی آوازوں والے تمام حروف (بھ ٹ ڈ ڑ چ گ) سے بننے والے الفاظ کو فحش قرار دے کر مردود قرار دے دیا۔ (اس کی تفصیل آگے آتی ہے) یہ سلسلہ آئندہ پچھتر سال تک چلتا رہا۔ اور یہی زمانہ ہے جب ہندی اور ہندوستانی زبان کے قضیئے نے سر اٹھانا شروع کیا۔ زبان کی تطہیر کے ٹھیکیداروں نے آخر میں ایک پہلوان نما محتسب تعینات کر دیا کہ وہ زبان کو پاک وصاف بنائے اور جو چوں چرا کرے اسے دھوبی پاٹ مار کے چت کر دے۔ موصوف نے نہایت احسن طریقے سے یہ خدمات انجام دیں انہوں نے کیچڑ کو کیچ تو بنا دیا مگر چوتڑ میں سے ڑ کو ہٹانے میں ان کی سانس پھولنے لگی۔ اب زبان اردوے معلیٰ ہوگئی۔ ناسخ کی تاریخ وفات (۱۸۳۸ء) ہے اور پانچ سال بعد سندھ کی فتح کے بعد انگریز پورے ہندوستان پر قابض ہو جاتا ہے۔

میرؔ جیسا بدمزاج شاعر وارن ہیسٹنگز کی شان میں قصیدہ کہتا ہے اور بھی متعدد نام ہیں جن پر نئے حکمرانوں کا رنگ چڑھتا جارہا تھا اور جو صاحب ایک عطار کے لونڈے سے دوا لیا کرتے تھے اب

پردہ پوشی پر مائل نظر آتے ہیں مثلاً

صدر کے ناچیے سے تا ناف۔۔۔ چپ کی جا گہ ہے کیونکہ کہئے صاف۔

اس سے پھر آگے غنچہ گل ہے۔۔۔ یاں سخن باعثِ تامل ہے

کیوں پڑی ران پر نظر تا ساق۔۔۔ اس تن اب زندگی ہوئی شاق

پنڈلی نازک ہے شاخ سنبل سی۔۔۔ پشت پر پنکھڑی سی ہے گل کی

اور آخر میں

سراپا میں جس جا نظر کیجئے۔۔۔ وہیں عمر اپنی بسر کیجئے

کیا یہ اشعار کسی مابوس عورت کو دیکھ کر کہے جا سکتے ہیں؟ شاعری میں ہمارا محبوب مرد کیوں ہے اس کی وجہ مذہبی ہے۔ اظہار بیان کا کمال ملاحظہ کیجئے

ع لذت دنیا سے کیا بہرہ ہمیں۔۔۔ پاس ہے رنڈی و لے ہے ضعف باہ

میکدہ میں گر سراپا فعل نامعقول ہے۔۔۔ مدرسہ دیکھا تو واں بھی فاعل و مفعول ہے

یا فقیر صاحب کی سنئے

مجھ کو شہوت ہوئی تیمم سے۔۔۔ تھی یہ بے شک کسی چھنال کی خاک

اسماعیل منیر شکوہ آباد (۱۸۱۳۔۱۸۹۱) عورتوں کی خودارادیت کے لیے فعل مختاری کی اصطلاح یوں نظم کرتے ہیں

ع فعل مختاری پہ ہو خدا کی مار۔۔۔ کہ تھکاریاں ہوں خود مختار

کوئی پچھتر برس کے بعد سرسید اسباب بغاوت ہند میں لکھتے ہیں (۱۸۵۸ء) ''ضابطہ عورتوں کا جو فوجداری سے عدالتوں میں جاری تھا کس قدر ہندوستانیوں کی عزت اور آبرو اور رسم و رواج میں نقصان پہنچاتا تھا۔ منکوحہ عورتیں تک فوجداری سے فعل مختار ہو گئیں۔ ولیوں کی ولایت

عورتوں پر سے اٹھ گئی اور یہ باتیں صریح مذہب میں نقصان پہنچاتی تھیں۔"

نوبت یہ آ گئی کہ مصحفی اور امام ناسخ کے جو دواین بعد از مرگ شائع کئے گئے اس میں ان کے شاگردوں نے ترمیمات کر دیں اور مبینہ فحش لفظوں کو نکال دیا گیا۔ عظیم آباد اور مرشد آباد کے باسی اپنے حسابوں سے خود کو اہل زبان سمجھتے ہیں اور اپنے شہر کو اردو قرار دیتے ہیں (لیکن وہ غلطی پر ہیں) شمس الرحمان فارقی حوالہ دریائے لطافت۔ یہی حال سرنگا پٹم میں ہے جہاں قصہ و گوہر کا فارسی سے ترجمہ عارف الدین کرتا ہے اور سری گنیش کو سنسکرت سے ہندوستانی قالب میں ڈھالا جاتا ہے۔ سرنگا پٹم دلی کے جنوب میں کوئی سولہ سو کلومیٹر اور راس کماری سے ۴۵۰ کلومیٹر شمال میں واقع ہے۔

(12) اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں شریف آدمی کی تعریف کچھ یوں بیان کی گئی ہے ۔" مہذب انسان وہ سمجھا جاتا تھا جو رقص و موسیقی سے گہری دلچسپی رکھتا ہو، عشق پیشہ ہو، شاعر، حاضر جواب اور لطیفہ باز ہو، چست فقروں سے محفل کو گرمائے اور جس کی تلوار کی بجائے زبان پر سان رکھی ہو۔" ارتقا ۴۴/۳ ۱۰۲۔ غور فرمایئے ہندوستان اتنا فکری طور پر ترقی کر چکا ہے کہ سپہ گری حمیدہ اوصاف میں شامل نہیں ہے۔

(13) ان شہادتوں سے کیا ثابت ہوتا ہے کہ ہندستانی سماج ملوکیت اور بادشاہت کے چنگل سے آزاد ہوتا جا رہا تھا اور لوگ تقویٰ اور ریا کاری سے نجات پا کر زندگی سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں مگر بالا دست طبقات کو یہ منظور نہ تھا۔ انہوں نے پہلے نادر شاہ اور پھر دو مرتبہ احمد شاہ ابدالی کو مہمان بلایا۔ شاہ ولی اللہ کا خط ابدالی کو (اپنا گریباں چاک) اس کے باوجود ہندوستانیت اور ہندوستانیوں کے سامنے اُن کی دال نہیں گل رہی تھی کہ برطانوی سامراج آ گیا اسے کہتے ہیں چھینکا ٹوٹا بلی کے بھاگ۔

(14) اُس وقت تک برصغیر میں بولی جانے والی زبان/ بولی مختلف ناموں سے کشمیر سے راس کماری تک اور چمن سے ڈھاکہ تک بولی جاتی تھی جس کو ہندوستانی / ریختہ/ ہندی/ ہندوی/ گجری/ دکنی یا اردو کہا جاتا تھا برنارڈ کوؔن کے (ص۔ ۱۲۶ اردو کا ابتدائی زمانہ) بقول یہاں دو زبانیں ایک فارسی دوسری ہُندستنک تھی۔ موخر الذکر کی اس نے دو قسمیں بتائی ہیں مثلاً ع

مصحفی فارسی کو طاق پر رکھ۔۔۔ اب ہے اشعار ہندوی کا راج

اسی زمانے میں استیصالی قوتوں کے نمائندے بن کر شاہ حاتؔم (۱۷۸۳۔ وفات) نمودار ہوتے ہیں۔ ان کا حوالہ دیتے ہوئے شمس الرحمان فاروقی کہتے ہیں (فاروقی کا جھکاؤ قدامت پسندی کی طرف ہے) ''افسوس کی بات یہ ہے کہ شاہ حاتم کے گوشوارہ عمل کا منفی پہلو ہی مستقبل کے مورخ کی نظر چڑھا۔ اس طرح حاتؔم کی کوشش جو ایک غیر مذہبی، جدید شایستہ، با محاورہ زبان ہے، تبصرہ ملاحظہ کیجیے، یعنی ایسی زبان جو خواندگی کے اعلیٰ معیار پر پوری اترے لیکن بوجھل نہ ہو) کے حق میں تھی۔ ''اصلاح زبان'' کی مہم قرار دی گئی اور حاتم کو بیٹھے بٹھائے زبان کا مصلح قرار دیا گیا (۔۔۔۔ گویا زبان بچاری کسی چھوت کے مرض میں مبتلا تھی'') جبکہ موصوف پچھلے صفحے پر حاتم کا اعتراف نقل کر چکے تھے۔ ''بندے نے گذشتہ بارہ برس سے بہت سے الفاظ ترک کر دیئے ہیں۔ اس نے عربی اور فارسی کے انہی الفاظ کا استعمال منظور رکھا ہے جو قریب الفہم اور کثیر الاستعمال ہیں اور روزمرہ دہلی کو، جسے مرزایان ہند اور فصیحان رند اپنے استعمال میں رکھتے ہیں [بھی منظور رکھا] اور ہر دیار (ادھر اُدھر) کی زبان ہندی بھی جسے کہ بھاکا کہتے ہیں موقوف کر دی ہے۔ اور محض وہ روزمرہ اختیار کیا ہے جو عام فہم اور خاص پسند ہے۔'' (زور کس پر ہوا خاص پسند پر) حوالہ ختم (دیوان زادہ) اردو کا ابتدائی زمانہ ۱۵۲۔۱۵۳

(15) یوں اٹھارویں صدی کی آخری چوتھائی میں صفائی اور تطہیر کا عمل وبائی صورت اختیار کر لیتا ہے جسے دیکھ کر ایک غیر ملکی گلکرسٹ کو یہ کہنا پڑا جو حرف بحرف درست پیش گوئی نکلی''۔۔ بالاخر یہ ہوگا کہ ہندو لوگ قدرتی طور پر ہندوی'' کی طرف جھکیں گے اور مسلمان لامحالہ عربی اور فارسی کی پچ کریں گے۔اس طرح دو اسلوب جنم لیں گے۔۔۔سال تحریر (۱۷۹۸ء) حوالہ ختم ابتدائی اردو صفحہ۔۲۸ (ش۔ف)

(16) اشرافیہ طبقے نے تو اپنے مقاصد حاصل کر لیے لیکن اس منزل پر قران پاک کو ہندوستانی زبان میں ترجمہ کرنے کی ضرورت پڑ گئی کیونکہ چھپائی کی سہولت میسر آ گئی تھی۔ ہندوستان میں اور ہندوستانی میں شاہ عبدالقادر کا ترجمہ (۱۷۸۰ء) میں چھپا ہے۔ چونکہ مقامی الفاظ کو جو مندرجہ بالا چھ حروف سے بنتے تھے مردود قرار دیا جا چکا تھا انہیں کیونکر استعمال میں لایا جاتا تو یہ ترکیب نکالی گئی کہ ان کے گمراہ کن معنی درج کر دیے گئے۔مگر غور کرنے سے اصل معنی سمجھ میں آ جائیں اور آج تک تمام مترجمین کم وبیش اسی پر عمل درآمد کر رہے ہیں۔

مثال نمبر ایک

سورہ نساء کی ۲۴ ویں آیت میں لفظ اُجُورہُن کے معنی ''مہر'' درج کر دیئے گئے حالانکہ اسی سورہ کی چوتھی آیت میں نحلہ کے معنی ''مہر'' موجود ہیں جو لوگ سعودی عرب میں رہ چکے ہیں وہ اچھی طرح سے واقف ہیں کہ وہاں آٹو ٹیکسی پر ''اجرہ'' لکھا رہتا ہے جس کے ہندوستانی زبان مین معنی ہوتے ہیں بھاڑہ جس کی جمع ''بھاڑے'' بنتی ہے۔اجر واحد ہے اُجورہ تثنیٰ اور جمع اُجُورہُن۔

مثال نمبر۲۔سورہ الانبیاء ۲۱:۹۱ فَرجَھا ترجمہ عورت جس نے قید میں رکھی شہوت

النور۲۴:۳۰ فُرُوجَھُمْ بیٹی عمران کی جس نے روکی اپنی شہوت

النور۲۴:۳۱ فُرُوجَھُنّ اور تھامتی رہیں اپنی ستر

تینوں آیات میں ایک ہی لفظ فَرج واحد تثنیٰ اور جمع کی شکل میں آیا ہے۔ جس کے معنی آیات کے سامنے بیان کئے گئے ہیں۔ مجھے ۱۷۹۰ء کا شیخ قادر کے پہلے ہندوستانی زبان میں ترجمے کا قلمی نسخہ بھی دیکھنے کا موقع ملا ہے۔

اس لفظ کے معنی مفردات القران میں امام راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ/ ۱۱۰۸ء لکھتے ہیں کہ ''الفَرج والفرجۃ'' دو چیزوں کے درمیان شگاف کے ہیں جیسے دیوار میں یا دونوں ٹانگوں کے درمیان کشادگی اور کنائے کے طور پر فُرج۔ یہاں عبدہ صاحب نے بھی عربی لفظ فُرج استعمال کیا ہے اور کوئی مقامی لفظ نہیں لکھا۔ ترجمہ شیخ الحدیث مولانا محمد عبدہ فیروز پوری جلد دوم صفحہ ۸۶۷ اقبال ٹاؤن لاہور جون ۱۹۸۷ء

ہمارے اُردو کے پہلے مترجم (۱۷۸۰ء) عربی الفاظ شہوت واحد اور جمع اور تثنیٰ ستر بطور معنی استعمال کرتے ہیں جو صفات ہیں۔ جبکہ موصوف عربی فارسی اور ہندوستانی زبانوں کے عالم تھے۔ مگر اٹھارویں صدی میں رائج اور مقبول ہندوستانی میں اس کے درست معنی والے الفاظ یعنی چوت/ بھوسڑی/ بُل یا بُر جیسے اسما کا استعمال نہیں کرتے اور ان کی پیروی میں آج تک دیگر مترجمین مکھی پر مکھی مارے جا رہے ہیں اور شرم گاہ ناموس عفت اور نہ جانے کیا الا بلا ترجمہ کئے جا رہے ہیں۔ شیخ صاحب نے ایسا کیوں کیا اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے یہ ہماری کوشش ہے۔ گاندھی جی کا یہ کہنا کہ اُردو اس لیے مسلمانوں کی زبان ہے کیونکہ یہ قرآنی خط میں لکھی جاتی ہے۔ جبکہ اُنہیں کہنا چاہیے تھا کہ مسلمان ہندوستانی میں غیر مطلوب عربی لفظ شامل کر دیتے ہیں۔

(17) آپ کے علم میں ہے کہ دنیا بھر میں اٹھارہویں صدی کا آخری ربع انتہائی مطلا طم گزرا ہے۔ برطانوی نوآبادیاتی نظام سے متحدہ امریکہ نے گلوخلاصی حاصل کی اور دنیا کا پہلا

انقلاب فرانس میں برپا ہوا۔ اگر اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف میں انگریز نہ داخل ہوتا تو شاید یہاں بھی فرانسیسی طرز کا کوئی انقلاب برپا ہو جاتا۔ ٹیپو سلطان کی قائم کردہ پارلیمنٹ نما ''زمرہ غم نہ باشد'' اسی کا اکھوا تھا (م۔ خ۔ ب)۔ مگر ہندوستان میں صورتحال معکوس ہونے لگی اور ہندوستان جو بادشاہت، آمریت تحکم پسندی اور عورت دشمنی کے چنگل سے نکلنے کی پون صدی سے جدوجہد کر رہا تھا اس نئے نظام میں جو گاڈ کی وجہ سے فطرتاً عورت دشمن تھا اس (پوپ کو آج بھی کوئی عورت نہیں منتخب کرتی) کی گرفت میں آ گیا۔ انقلاب فرانس ملوکیت اشرافیہ اور کلیسا کے شکنجے میں سے نکلنے لگا جس کی گرفت میں پورا یورپ تھا۔ اور جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کلیسا کا کلیدی پتھر گناہ کبیرہ پر قائم ہے اور اس کا منبع اور ابتدا کو عورت سے منسوب کیا جاتا ہے۔ فرانس میں اس سلسلے میں بھی بغاوت ہوئی جس کا سرخیل موسیو سیڈ تھا جس نے قید و بند کی تکالیف برداشت کیں مگر یہی کہتا رہا کہ مرد کی قوت مٹھی کے مکے میں اور عورت کی طاقت اس کے ٹٹے میں ہے۔ اس کا ذکر خال خال کیا جاتا ہے حال ہی میں اس پر Quills کے نام سے فلم بنی ہے یعنی پر والے قلم۔

(18) غیر ملکی حملہ آور حکمرانوں اور ان کے طفیلیوں کے علاوہ اہل ہند لنگوٹی کے علاوہ کوئی کپڑا نہیں پہنتے تھے یہ لفظ اردو کی تاریخی لغت میں پہلی مرتبہ (۱۶۷۸) میں نمودار ہوتا ہے اس کپڑے کا کام یہ ہے کہ یہ صرف میانی کو چھپاتا ہے۔ اس کا محاورہ مشہور ہے کہ ''وہ لنگوٹی میں مست ہے'' اب برطانوی آبادکاروں کے آنے کے بعد یہ کولھوں پر پھیلنے لگتی ہے اور بڑھ کر لنگوٹ کہلانے لگتا ہے اور لغت میں پہلی مرتبہ (۱۸۰۲ء) میں نمودار ہوتا ہے گاندھی جی کا ہندوستانی پہناوا اُسی کی یادگار تھا یعنی پتلی سوکھی ٹانگیں، ران تک ننگی نہ بنیان نہ کرتا ایک پسلی نمایاں (حمیدہ رائے پوری ہمسفر ص ۲۰۷)۔ گذشتہ صدی کی چھٹی دہائی تک میں نے کراچی کی

مضافاتی بستیوں میں نوجوان لڑکوں کو لنگوٹ باندھے دیکھا ہے اور عورتوں کو محفل میں دودھ پلاتے اور سرِ راہ پیشاب کرتے دیکھا ہے۔ میری عمر کے دیگر افراد بھی اس کی تصدیق کر دیں گے اس کے علاوہ برطانوی عہد کی پولیس/فوج بھی نیکر پہنا کرتی تھی۔

(19) میں نے یہ بات تفصیل سے اس لیے لکھی کہ سامراج کے داؤ پیچ بتا سکوں اٹھارویں صدی کے نصف میں چونکہ کپڑا بننے کی مشین کرگھا ایجاد ہوگئی تھی جو ایک دن میں ہندوستانی مزدور کی سال بھر کی چرخے کی پیداوار سے زیادہ کپڑا تیار کرتی تھی تو انگلستان میں 1770ء/ میں بڑھتی ہوئی پیداوار کی نکاسی کے لیے مسیحی اخلاقیات کو ہندوستان میں پروان چڑھایا جانے لگا، حیا، غیرت اور ستر کے تصورات نفوذ کر دیے گئے۔ اسی زمانے میں کپٹن کک (1769) جب تاہیٹی پہنچتا ہے تو کہتا ہے کہ۔ عورتیں بے انتہا خوبصورت ہیں۔ ہر طرف سبزہ و زرخیری و معتدل آب و ہوا سادہ زندگی معصومیت اور آزادی ہے،۔۔۔ جنسی آزادی تھی اور شرم و غیرت کا کوئی تصور نہیں تھا جس کے بوجھ تلے یورپی دبے ہوئے تھے۔ سہ ماہی تاریخ صفحہ 110 شمارہ۔ ۶

ایک ہسپانوی اکریگوویس پوچی (1512-1451) جو کولمبس کا دوست ہے لکھتا ہے یہاں لوگ فطرت کے اصول کے تحت برہنہ اور بغیر کسی شرم کے رہتے ہیں۔ صفحہ 111 سہ ماہی تاریخ۔ ۱۶ اشاعت 2000

میں اعداد و شمار پیش کرنے کی معافی چاہتا ہوں ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۸۰۴ء میں دس لاکھ گز کپڑا ہندوستان لاتی ہے اور ۱۸۳۵ء میں پانچ کروڑ دس لاکھ گز کپڑا درآمد کر کے فروخت کرتی ہے رسالہ منشور فروری 1969 از ممتاز حسین) یہاں پر برٹرینڈ رسل کی کتاب (The Impact of Science on Society ص ۳۳) کا حوالہ لطف پیدا کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اٹھارویں صدی میں افریقہ کے براعظم میں کپڑا نہیں پہنا جاتا تھا اور افریقی، ننگے رہتے تھے۔

اہل برطانیہ نے توپ/تلوار کے ذریعے انہیں کپڑے پہنا دیے آج کل بھی وہاں خواتین مظاہرہ کرتے ہوئے بے لباس ہو جاتی ہیں اور یہی حال برما کی خواتین کا ہے۔

(20) بات یہیں نہیں ختم ہو جاتی اوپر ارتقا۔۳۴ رسالے کے حوالے سے کہا جا چکا ہے کہ ہندوستانی مرد اٹھارویں صدی میں چڈیا بیگم کے رسیا ہو چکے تھے۔ آپ ہی کہئے جو لوگ تلوار اور جنگ سے بیزار ہو چکے ہوں وہ اپنے اعصاب کو کیسے پرسکوں رکھتے جب کہ کیمیا گری کے علاوہ تمام کرتبی (Empirical) علم و فضل پر پہرہ ہو اور تعلیم پر مذہبی ٹھیکیداروں/ سامراج کا قبضہ۔ اس سے یہ تو نہیں معلوم ہوتا کہ ہندوستان میں کتنی افیون پیدا ہوتی تھی مگر ایسٹ انڈیا کمپنی یا برطانوی سامراج نے ترشول (تین دھاری تلوار) سے کام لیا اور ہماری پیداواری صلاحیت کو (اڑیسہ، بہار، بنگال میں) جلا بخش کر افیون کو چین برآمد کرنا شروع کر دیا جس سے کاشتکاروں کو تھوڑا بہت فائدہ ضرور پہنچا۔ اسکے اعداد و شمار ملاحظہ ہوں تا کہ چینیوں کو مدہوش کر کے سامراج کی آمد کے لیے راہ نکالی جا سکے۔ میں اخباری معلومات کو اس لیے اہمیت دیتا ہوں کہ وہ لاکھوں لوگوں تک جبراً اطلاعات دیتے ہیں) کراچی کے روزنامے ڈان میں برجیس اصغر پانچویں دسمبر ۲۰۰۴ء کے شمارے میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے افیون کی فروخت کی ہندوستانیوں کے علاوہ یورپیوں پر بھی پابندی عائد کر دی۔ (۱۷۶۷ء) تک ہندوستان سے افیون کی برآمد دو ہزار (چیسٹ) یا صندوق ہو گئی جو سوا لاکھ کلو سے زیادہ ہوتی ہے۔ اور ہندوستان سے اس کی برآمد سرپٹ رفتار سے بڑھتی ہوئی (۱۸۳۵ء) میں بارہ لاکھ کلو اور ۱۸۴۰ء میں اکیس لاکھ کلو کا نقطہ عروج چھو لیتی ہے۔ اور اسی رفتار سے کپڑا درآمد کیا گیا۔ اور ہندوستانیوں کو پہنایا گیا۔

(21) ہمیں ہندوستانیوں اور چینیوں کے متعلق سامراجی اور اخلاقی پیمانوں اور نقطہ نظر سے جائزہ نہ لینا چاہیے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ جب مردوں کا حق خودارادی چھن جائے اور عورتین

''فعل مختاری'' سے محروم کر دی جائیں تو انہیں، کشمکش حیات سے پناہ ''چنّیا بیگم'' کے علاوہ کہاں ملے گی؟ اس سے سامراجی عزائم کو تقویت ملتی تھی۔

کیا ۱۹۸۰ء کے بعد مدرسے امرد پرستی میں ڈوبے ہوئے نہیں ہیں۔ پانسو مولویوں سے بچوں سے اغلام بازی کی تحقیقات ہو رہی ہے۔ (وزیر مملکت برائے مذہبی امور جنگ ۱۰۔۱۲۔۰۴) اور ہیرونچیوں کے معاملے میں ہم دنیا بھر میں سرفہرست نہیں ہیں؟ کیا ہمارے ہاں چالیس لاکھ عادی ہیرونچی موجود نہیں ہیں۔ اگر فعل مختاری پر حدود ارڈیننس نہ تھوپ دیا جاتا تو حالات پر بوسیدہ پردہ نہ پڑتا۔ پردہ اٹھنے کی دیر ہے۔ متعدی امراض سے محفوظ جنس کاری کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے پاکستان کی فعل مختار خواتین کا وفد ان دنوں کولکتہ کا دورہ کر رہا ہے (روزنامہ جنگ کراچی ۲۴۔۶۔۰۵) اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں ہے کہ جب مرد جنس میں حق خودارادیت کو استعمال کرتا ہے تو اسے زیادہ سے زیادہ رنڈی باز کہہ دیا جاتا ہے جو اپنے اندر افتخار کا عنصر رکھتا ہے مگر جب عورت ''فعل مختار'' کو برتتی ہے تو اسے درجن بھر الفاظ سے گالی دی جاتی ہے مثلاً کسبی، چھنال، خانگی، رنڈی، گشتی، بیسوا، تھتکار، طوائف، جسم فروش اور خام پارہ جبکہ رنگروٹ جو غربت کے مارے جان فروشی کرتا ہے اسے معزز پیشہ سمجھا جاتا ہے۔

(22) اٹھارویں صدی کے مغل بادشاہ معز الدین ابن شاہ عالم کی حکومت میں تان سین کے خاندان کی لال کنور کو ''امتیاز محل'' کا خطاب ملتا ہے ''اسے چتر شاہی اور شاہی نوبت کے ساتھ کوچ کرنے کی اجازت عطا ہوئی۔ دو کروڑ روپے سالانہ کا وظیفہ مقرر ہوا لال کنور کے نام کے سکے جاری ہوئے جواب نایاب ہیں۔ یہ وہی لال کنور ہے جو شہنشاہ ہند جہاں دار شاہ کو ساتھ ساتھ لیے (سال ہے ۱۳/۱۲/۱۷) ساقی خانوں میں پھرتی تھی اور شہنشاہ اپنے ہوش وحواس سے بیگانہ ان درباریوں کی معیت میں رہتا تھا جس کی زندگی کا مقصد محور شراب وشباب اور معیار سے گرے

ہوئے سب کام کرتا تھا۔ (بالکل اسی نوعیت کا دوسرا واقعہ سنیئے : حوالہ شروع :۔ محبوب مشیر امیر خاں (جسے عمدہ الملک بنا دیا گیا تھا یعنی وزیر اعظم) کی بیوی کوکی تھی جو شاہ جان محمد خان ایک درویش کی بیٹی تھی۔ اسے اس پر اس قدر اختیار تھا کہ اس نے اسے ذاتی دستخط کرنے کی اجازت دے رکھی تھی اور جس کی وہ اپنی مرضی سے استعمال کرتی تھی۔ وہ سرکاری امور کی درخواستوں پر بھی ''بحکم'' دستخط کرتی اور حرم سرا میں اپنے ساتھ لے جاتی۔ اپنے آپ کو نظر انداز پا کر آصف جاہ (نظام) نے خود کو دربار سے علیحدہ کرلیا۔ سال (۱۷۳۷ء) حوالہ ختم کتاب تاریخ پنجاب س۔م۔لطیف

(23) دونوں مورخین کے ہم ممنون ہیں کہ انہوں نے یہ قصہ تفصیل سے لکھ دیا مگر تاریخ دان کے لباس فاخرہ میں پنہاں مصلح اور مردانہ دادا گیری صاف بول رہی ہے۔ اس کی شاہ پرستی اور ایمان سے وابستگی اس سے عیاں ہے کہ جب ایک اصل ہندوستانی عورت زمام اقتدار ہاتھ میں لیتی ہے تو وہ بادشاہ کو بدحواس اور شراب وشباب میں غوطہ زن کہتا ہے بجائے اس کے کہ یہ کہتا کہ دیکھو بادشاہ اتنا عوام دوست ہے کہ بغیر کسی تام جھام کے عوامی جگہوں میں آتا جاتا ہے۔ اور مقامی آبادی سے اشتراک اقتدار کے اس نمونے کی تعریف کرتا اور یہ کہتا کہ ہندوستانی عورت کس قدر توانا اور باشعور ہو چکی ہے۔ مزید براں یہ بھی کہ سکتا تھا کہ یہ ایک عورت ہے جو مسلماں نہیں ہے اس کے باوجود بادشاہ اسے اپنے ہم پلہ سمجھتا ہے۔ تبصرے میں موصوف کو شاید یہ بھی کہنا چاہیے تھا کہ خوش انتظامی یا اس کی بدانتظامی سے خلقت یا رعیت کو کیا کیا فوائد یا نقصانات پہنچے۔ ارتقا شمارہ ۳۴/صفحہ ۱۰۳

(24) دور حاضر میں اس سے ملتا جلتا واقعہ انگلستان میں ہوا ہے۔ شہزادہ چارلس کا میلا باؤلی پارکر کے ہمراہ نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرتا رہا اور پینتس سال گذر گئے تب دونوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا جو مارچ ۲۰۰۵ء میں انجام پا سکی اگر حالات پر سرسری سی نظر ڈالیں تو

معلوم ہو جائے گا کہ برطانوی معاشرہ جو ۱۹۲۱ تک عورت کو محو خواب حسینہ سے زیادہ نہ جانتا تھا۔ اب انسانی تعلقات کی حد تک عورت کو قریب قریب ہم پلہ سمجھنے لگا ہے اور ان کے ہاں زندگی کی ترجیحات میں صحت، تعلیم روزگار اور خوشحالی کے بعد نکاح کا نمبر آتا ہے۔ یوں مورخین کا یہ کہہ دینا کہ اٹھارویں صدی کا ہندوستان بے راہ روی، طوائف الملوکی اور عیش و عشرت کی صدی تھی محض ہٹ دھرمی، تنگ نظری اور ستنامیوں کی توہین ہے۔ آمریت کا خوگر ہونا ہے اور واقعات تحکم پسندی کی عینک سے دیکھنا ہے۔ یہ اس لیے کہا جا رہا ہے کیونکہ نئے برطانوی آقا کے وطن میں یہی دستور تھا۔

اب ہم اس دور میں داخل ہوتے ہیں جب ۱۸۲۵ کے لگ بھگ زبان تسنیم و کوثر سے دھل چکی ہے اور اس کا سانچہ امام بخش ناسخ اور میر امن نے تیار کر دیا جس سے انحراف کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا یہ وہی زمانہ ہے جب دلی کالج قائم ہوتا ہے اور سائنسی علوم سمیت تمام متداول مضامین کے لیے ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ کیونکہ زبان اب (عام فہم اور خاص پسند ہو چکی تھی) اور اب سات زبانوں کی دھنک میں سے چھ زبانیں وجود سے عدم کو سدھار چکی ہیں اور تطہیری اردو کا بول بالا ہے دیگر زبانیں گمنام ہو رہی ہیں مگر چلن میں کمی نہیں آتی۔ زبان کا ارتقا کسی کل کی طرح نہیں ہوتا اس لیے ہم بہ اطمینان یہ کہہ سکتے ہیں کہ گذشتہ دو سو برس سے ایک مقرر سانچے میں شعر و شاعری اور نثر نگاری ہو رہی ہے جس میں باقی ماندہ زبانوں کے لفظ ہندوستانیوں کی وجہ سے چوری چھپے داخل ہو گئے تو جدا بات ہے ورنہ زبان کا مزاج خواص پسند اور جمہور سے بیزار منفی قوتوں کا تخلیق کردہ ہے۔ اس لیے ہمیں کسی ایسے نقاد کی ضرورت ہے جو اسے اٹھوا کر آبادی سے دور تاریخ کے گھورے پر پھینک آئے تا کہ اس ادبی موہنجو ڈرو کی زیارت کو ہم جب چاہیں جایا کریں۔ ہمارے محترم نقاد بہت مظلوم ہیں جو اس مرغی کی طرح ہیں جو کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں سے پنجوں سے

کرید کر اشیاء خوردنی تلاش کرتی رہتی ہے۔ اور اس پر ایک وسیع و عریض تختہ اس عبارت کا نصب کر دیا جائے کہ یہ فکری ''غلاموں کنیزوں کی مساعی کا نتیجہ ہے جنہیں نوعمری ہی سے بھوکوں مر جانے کا خطرہ رہتا تھا۔ جس قوم کے ہر فرد کو بالغ ہوتے ہی فاقہ کشی کا سامنا کرنا ہو وہ کیا تخلیق کر سکتا ہے۔ بقول نظیر اکبر آبادی:

ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے۔۔۔ بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

اس ادبی ورثہ کا معتد بہ حصہ جمہور دشمن بھی ہے۔ پاکستان کے عالم وجود میں آنے کے بعد سے حجازی لفظ بڑی تیزی سے داخل ہونے لگے اور ان کی یلغار سے فارسی لفظوں کی حق تلفی شروع ہو گئی محاورہ: جیسے خدا حافظ گذشتہ صدی کی نویں دہائی سے اللہ حافظ بنتا جا رہا ہے۔ اب ہم اٹھارویں صدی میں اورنگ زیب (۱۷۰۷) کے بعد پھیلی ہوں مبینہ طوالف الملوکی کی طرف لوٹتے ہیں تو ہمیں یہ دکھائی دیتا ہے۔

(26) اگر نادر شاہ اور دو مرتبہ احمد شاہ کے حملوں کو شامل کر لیا جائے جس میں دونوں بالفعل ہندوستان کے بادشاہ ہو گئے تھے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۷۰۷ سے ۱۷۶۱ء تک چون برس کے عرصے میں دلّی میں چودہ بادشاہ سریر آرائے تخت ہوتے ہیں جس میں سے سات یعنی آدھے ۱۷۰۷ء سے ۱۷۱۹ء کے بارہ برسوں میں تخت پر براجمان رہے چونکہ ہمارے اکثر مورخین معاشیات کے اصولوں کے تحت تاریخ نویسی نہیں کرتے اس لیے نتائج گمراہ کن ہو جاتے ہیں۔ کم از کم مجھے نہیں معلوم کہ اس چون برس کے عرصے میں ہندوستان کے عوامل پیداوار کتنے مستعد تھے اور دولت آفرینی کتنی ہو رہی تھی مگر میں آپ کو دور حاضر کا منظر دکھاتا ہوں۔ 5 دسمبر ۸۸ء سے اگست ۲۰۰۴ء کے عرصے میں پاکستان میں دس وزرائے اعظم بدلتے ہیں اسی طرح بھارت میں جہاں کی معاشی ترقی کے پیمانے میری دسترس میں نہیں ہیں نرسمہا راؤ سمیت کتنے وزیر اعظم

بنے؟ ۱۹۹۲ سے آٹھ یا دس پردھان منتری بدلے ہیں اور آخری دو وزرائے اعظم واجپئی اور من موہن سنگھ بالترتیب ۲۴ جماعتوں NDA اور UPA کی اٹھارہ جماعتوں کے اتحاد کے مرہون منت ہیں جسے ہم کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑہ بھان متی نے کنبہ جوڑا کہہ سکتے ہیں جس میں واجپئی کی تیرہ روزہ وزارت عظمیٰ بھی شامل ہے اسے کوئی طوالف الملوکی کیوں نہیں کہتا۔ اب میں ایک واقعہ جو لاطینی امریکہ سے متعلق ہے کا حال بیان کرتا ہوں جہاں کی معاشی سرگرمیوں کے متعلق ہماری ناقص معلومات مغربی میڈیا کی مرہون منت ہیں۔

(27) ارجنٹاین میں دسمبر ۲۰۰۱ سے لے کر جنوری ۲۰۰۲ کے ساٹھ دنوں میں پانچ صدور کو برطرف کیا گیا یا مستعفی ہونا پڑا۔ درحقیقت یہ ایک سو بیس ارب ڈالر کے ہیر پھیر کا شاخسانہ تھا۔ پاکستان میں ٹیکس کے جال میں بڑے بڑے سوراخ ہیں اس لیے ہمیں نہیں معلوم کہ پاکستان میں کتنی دولت آفرینی ہو رہی ہے۔ مگر دس وزرائے اعظم رخصت ہوئے۔ یہی حال اٹھارویں صدی کے ہندوستان کا ہے۔ ہنٹنگٹن کلیش آف سویلائزیشن میں بتاتا ہے کہ ہندوستان 1750 میں دنیا کی ایک چوتھائی GDP دولت پیدا کر رہا تھا یہ وہ سال ہے جب ہمارے مظلوم رنگیلے کا عہد ختم ہوتا ہے۔ جس کے ۲۹ سالہ دور کے بعد بادشاہ بدل رہے ہیں۔ ستنامی (کسان، دستکار، سنار، ترکھان اور بھنگی) طبقات پیداواری عمل میں بھرپور حصہ لے رہے ہیں عورتیں برابر کی شریک ہیں اور مردوں کو خاطر میں نہیں لاتیں جس سے مردانہ بالادستی خطرے میں ہے اور پیداواری عمل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہیں زندگی سے لطف اندوز ہو رہی ہیں ان کے رنگ ڈھنگ ملاحظہ ہوں۔ واقعہ اٹھارویں صدی کے پہلے نصف کا ہے۔

خصم کو جورو اٹھ مارے۔۔۔ گریباں باپ کا پھاڑے

زنوں سے مرد بھی ہارے۔۔۔ عجب یہ دور آتا ہے

جب کہ سو برس بعد مارکس لندن کی سڑک پر شوہروں سے پٹتی ہوئی عورتوں کو بچاتا ہے۔ آگے سنئے

نو خصم گن کر مشعلچن نے کیئے۔۔۔تو بھی نہیں رہی شاخہ بن دیے

دیکھو پکوان والی کی مذاخیں۔۔۔خصم کے روبرو دیتی ہے شاخیں

(ہماری البرتھ ٹیلر بھی نو شادیاں کر چکی ہے)

''ہر مہینے کی سات تاریخ کو دہلی کی عاشق مزاج عورتین پوری طرح بن ٹھن کر اور نمائش و آرائش کے ساتھ زیارت کی تقریب سے گروہ درگروہ آتی ہیں لیکن حقیقت میں مقصد دوسرا ہوتا ہے۔ سیر و تفریح کرتی پھرتی ہیں اور جن لوگوں سے ان کا تعلق ہوتا ہے ان کے ساتھ مل کر دادعیش دیتی ہیں۔'' لوران وو یتی شاہ عالم ثانی کے دربار میں ۱۷۷۴ء میر تقی میر کی خودنوشت از محمد بن عبدالوہاب صفحہ ۴۵۰۔

(28) اس کے برعکس بالائی طبقات دولت کی لوٹ کھسوٹ اور جمع کرنے میں لگے ہیں ہندوستان کے تمام حصوں میں ہر خطہ یا صوبہ مرکز سے اپنے حقوق مانگ رہا ہے یا مرکز کے مطالبات کو تسلیم نہیں کر رہا جس پر مرکزیت پسند مقتدرہ کا گماشتہ مورخ شورش، بغاوت اور طوالف الملوکی کا راگ الاپے جا رہا ہے۔

(29) جس کی مختصر تفصیل یوں ہے آصف جاہ (۱۷۴۸ء) دکن، راجہ جگل کشور (۱۷۴۹) بنگال اور اس کا بیٹا جواہر سنگھ (۱۷۶۸ء) راجہ جے سنگھ (۱۷۳۸ء/۱۱۵۱ھ جے پور) ملتان کے سکھ اور ان کو سرکوبی کرنے والا اعماد الملک (۱۷۵۲ء) سورج مل جو دلی کو لوٹ لیا کرتا تھا۔ (۱۷۵۳) اور اٹھارویں صدی میں مرہٹے مغل فرمان کے تحت جنوبی ہند میں جمعداریا کلکٹر بن چکے تھے اسی لیے وہ دلّی کو بچانے کے لیے تیسری پانی پت میں احمد شاہ کے خلاف لڑے۔ حیدر علی (جنوبی ہند

۱۷۵۴ء) مظفر جنگ (۱۷۷۰ء فرخ آباد)۔ مرزا نجف خاں بہادر (۱۷۶۵ء) کوڑا، ملہار راو ہولکر چرواہا گڈریا (۱۷۶۸ء اندور) مادھوراد ہولکر (۱۷۶۸) حافظ رحمت خاں (۱۷۷۲ شاہجہان پور) شجاع الدولہ (۱۷۷۵ء فیض آباد) آخر میں مادھوراو سندھیا (۱۷۹۲ء) جسے بادشاہ نے ''فرزند جگر بند'' کا خطاب دیا۔ آپ چاہیں تو خان دوراں کو بھی اس فہرست میں شامل کرلیں جس نے (۱۷۴۸) میں بغاوت کی تھی جو رنگیلا کی حکومت کا آخری سال ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ سورج مل کو چھوڑ کر کسی نے دہلی پر قبضہ کرنے کی کوشش نہ کی۔ علاوہ ازیں عورتیں خود کو ایک حد تک منوا چکی تھیں۔ کیونکہ رنگ رلیوں کے لیے دو مردوں میں کم از کم ایک عورت کا وجود ضروری ہے۔

(30) جبکہ اس وقت علم و ادب شاعری فنون لطیفہ صحت مند خطوط پر چل رہے تھے۔ عورتوں /مردوں کے لیے زندگی سے محظوظ ہونے کے تقریباً مساوی مواقع حاصل تھے اور نکاح ترجیحات میں نیچے جانے لگا۔ جو صرف بادشاہوں امرا میں مقبول تھا جسے مردانہ دادا گیری کا حامل تاریخ نویس فحاشی، عریانی اور بے غیرتی پر محمول کرتا چلا آرہا ہے جبکہ صورتحال کچھ یوں ہے عین ۱۷۵۷ء میں مشرق سے انگریز سامراج بندر بانٹ کے لیے آدھمکتا ہے۔ تاکہ نجیب الطرفین وارث تخت حاصل کیا جائے۔ جیسے ۱۸ برس کی باکرہ ڈایانا کو MI.5 نے کس مشکل سے تلاش کیا۔ شادی کے بندھن کے بغیر دس لاکھ لڑکیاں انگلستان میں ہر سال حاملہ ہو جاتی ہیں۔ (روزمانہ جنگ کراچی یکم مئی ۲۰۰۵ء)

اس مرحلے پر آپ ابوالفتح روشن اختر محمد شاہ رنگیلا کی حکومت پر غور کیجیے یہ ۱۷۱۹ء میں تخت نشیں ہوتا ہے کسی سے جنگ آزما نہیں ہوتا بلکہ اس پر ایک مرتبہ نادر شاہ (۱۷۳۹ء) اور پھر اس کا سالار احمد شاہ ابدالی حملہ آور ہوتے ہیں۔ ڈاکے صرف دولت کے مراکز پر پڑتے ہیں۔ مگر وہ خود کہیں

بھی حملہ نہیں کرتا۔ اور اشوک کی طرح جنگ مخالف ہے۔ اس لیے مورخین نے اسے امن پسند کی بجائے رنگیلا ٹھہرا دیا۔ اس کی تیس سالہ حکومت کے متعلق تفصیلات ملاحظہ کیجیے

غلام حسین طباطبائی اپنی تصنیف سیرۃ المتاخیرین (۱۷۸۱ء) میں لکھتے ہیں ''اس کے عہد میں خلقت کی زندگی پر آسائش نظر آتی ہے۔''

اسی طرح سید محمد لطیف تاریخ پنجاب سن اشاعت ۱۹۹۴ء سن تصنیف ۱۸۹۱ء میں صفحہ 400 پر رقم طراز ہیں۔ ''اور پنجاب میں ۱۷۳۸ء میں ہندوستان پر نادر شاہ کے حملے تک یعنی اکیس برس تک مکمل امن و امان قائم رہا۔ یہ سرحدی صوبہ ہے اس کی زراعت صنعت و حرفت کی حالت پر تحقیق درکار ہے۔'' اب رنگیلے کا تدبر ملاحظہ کیجیے۔

نادر شاہ دو دن پہلے کرنال پہنچ جاتا ہے (صفحہ ۴۱۳)۔ دہلی کا بادشاہ اپنی فوجوں کی قیادت کرتا ہوا وہاں پہنچتا ہے۔ اس کے ایک سپہ سالار نے ایرانی نادر شاہ کی آزمودہ کار فوجوں سے نبرد آزما ہونے کا خطرہ مول لیا اور یہ شکست کھاتا ہے اور قیدی بن جاتا ہے۔ مغلیہ افواج کی شکست اور پسپائی کے تیسرے روز محمد شاہ نے فاتح کی نرمی حاصل کرنے کے لیے اپنے تخت و تاج سے دستبردار ہونے کا ارادہ کرلیا۔ چنانچہ نادر شاہ کو اپنی مرضی سے آگاہ کرنے کے بعد نادر شاہ نے بادشاہ کا دروازے پر استقبال کیا نادر شاہ نے اپنے ہاتھ سے محمد شاہ کو کھانا پیش کیا۔ یہ تاریخ اس وقت رقم کی گئی ہے جب مغلوں کے متعلق کلمہ خیر نکالنے پر انگریز کی ناراضی مول لینے کے برابر ہے۔

(32) اب آپ غور کیجیے کہ ایک عیاش اور مدہوش شخص اپنے ملک اور رعایا کی جان اور مال بچانے کے واسطے تخت سے دستبردار ہو رہا ہے جب دنیا میں استعفیٰ دینے کا رواج بھی نہ تھا اور سفارت کاری کا کمال ملاحظہ کیجیے کہ فاتح نادر شاہ کھانا پیش کرتے ہوئے یہ کہتا ہے ''چونکہ حضور

کی یہاں تشریف آوری نے مجھے عزت بخشی ہے لہٰذا ہم بھائی ہیں اور آپ ہندوستان کی بادشاہت پر خوش رہیں'' کیا کوئی ہوشمند شخص اب بھی محمد شاہ کو رنگیلا کہہ سکتا ہے؟

اب آپ نادر شاہ کو دلّی سے حاصل ہونے والی دولت کا اندازہ لگائیے، سونا، ہیرے جواہرات کے محل میں ڈھیر لگا دیے گئے اور تخت طاوس بھی نادر شاہ کو مل گیا اس کے علاوہ اُس نے ۲۵ کروڑ روپے سونے کے سکوں کا مطالبہ کیا جو پورا کیا گیا جس کی مالیت آج ۱۲۵ ارب روپے کے برابر ہے۔ اور بقول فریزر وہ اپنے ساتھ ۱۳۰ خطاط ۲۰۰ لوہار، تین صد راج مستری، سو سنگ تراش اور دو سینکڑے بڑھئی بھی لے جاتا ہے۔ کیا یہ غصبِ دانش و حرفت نہیں ہے؟ کیا ہنٹنگٹن غلط کہتا ہے کہ ہندوستان سونے کی چڑیا ہے۔ اسی وجہ سے چند سال کے بعد ابدالی چڑھ دوڑتا ہے۔

اب دیکھیے تاریخ کا پہیہ الٹا چلتا ہے اب پھر ہنٹنگٹن کی سنئے جو اعداد و شمار کا شوقین ہے۔ ہندوستان میں باقاعدہ پہلی مردم شماری ۱۸۸۱ میں ہوئی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ آئندہ سو برس میں ہندوستان کی جی ڈی پی گھٹتے گھٹتے (۱۸۵۰ء میں) عالمی دولت کا محض ۸٫۶ فیصد رہ جاتی (جدول صفحہ ۸۶) تو اس عرصے میں افلاس زدہ علمی ادبی اور فکری اور اخلاقی گھٹن بدترین ادبار اور سڑاند کا شکار ہو جاتے ہیں جس کا ہمیں آج تک احساس نہیں ہے۔۔ زبان جو حق خودارادیت کی پہلی اور آخری شناخت ہے ہندوستانیوں کی زبانیں ملیامٹ کر دی گئیں یا ہو گئیں اور ایک مریضانہ زبان جو غلامانہ ذہنیت اور غلاموں کی روح اور جسم کے رشتے کو قائم رکھنے کے لیے کافی تھی چھوڑ دی گئی ۔ہمیں شرمیلا، مریضانہ ذہنیت، توانائی سے محروم حقیقی جذبات سے عاری اور عوامی امنگوں سے محروم ادب کیوں نظر نہیں آتا؟ جسے ہم گلے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ جس ادب پر ہم آج فخر کر رہے اور اس میں فدوی/حقیر/پرتقصیر/عاجز/ہیچ مقدار، خاک پا، بندہ بے دام، بے خود/گناہ گار/عاصی/

عاجز/آشوب جیسے لفظ مقبول ہوتے گئے اور ناموں کا حصہ بن گئے۔ حالانکہ دوسو برس پہلے (۱۶۴۵) میں فرانسیسی سیاح برنیر ہندوستانی ناموں کو مبالغے کی حد تک پر افتخار کہتا ہے جسے عالمگیر شاہ عالم/ عالم پناہ/ عالی/قمر الدین/شمس الدین/ جگدیو/قمر النساء جبکہ آج کل امریکی صدر ایک جھاڑی (بش) ہے اور نانبائی (بیکر) وزیر خارجہ رہ چکا ہے۔نوآبادیاتی لوٹ کھسوٹ کی چند مثالوں کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں جبکہ نسل پرست سامراجی نظام سے آزادی حاصل کرنے والے جنوبی افریقہ کے آئین میں دس سرکاری زبانیں ہیں۔

یوں آٹھارویں صدی کے آخری برسوں میں موت کی حکمرانی سے بچنے کے لیے اللہ رکھا، اللہ وسایا، اللہ بخش، اللہ بچایا، اللہ ڈنو، اللہ رکھی اور رام غلام جیسے ناموں کا چلن ہوا۔ یا پھر تاریخ سے متاثر ہو کر ڈاکوؤں والے نام جیسے سنکدر رحیات، علی سکندر، خاطر غزنوی، محمد غوری جیسے نام رکھے گئے مگر ہندوستان کو بچانے کی کوشش کرنے والے بادشاہ پر کسی نے پورس رام، علی یا پورس حسین کا نام نہ رکھا۔ تاہم ہندو مسلم اتحاد کی علامت کے چند نام ضرور سننے میں آئے مثلاً حنیف رامے، امین چند، اور مالک رام سیوا جی ولد شاہ جی اور مورخ ہندو شاہ۔ مگر غلامی اتنی سرایت کر گئی کہ غلام غوث ہزاروی، غلام محمد، غلام علی، کنیز فاطمہ، کنیز زہرا، بھگوان داس، یا پھر وفاداری کی تعلیم مکمل ہونے پر کلب صادق، /کلب عباس/کلب جواد جیسے نام وغیرہ وغیرہ۔

جبکہ پاکستان میں ان دنوں سیکولر نام اس نوعیت کے ہیں گلفام، جاوید کالا، عمران حلوائی، کامران چھٹا پیٹی، ناصر ٹنڈا، زافہ ٹھونڈا، ندیم شری، امین کالیا، ارشد دھوبی، کامران ڈکیٹ اور حبیب لنگڑ اوغیرہ روزنامہ جنگ کراچی ۱۸۔۶۔۰۵۔ اسی طرح دیہات کے سیکولر نام سنئے ۵۰ سالہ منو بھل، ۷۰ سالہ خاتون رکھو، والد کھیرا ۸۰ سال، سالا ۴۰ سالہ موتا، ۲۴ سالہ بیٹی مومل، ۱۵ سالہ چمن، ۱۶ سالہ بیٹا کانجھی، ۹ سالہ بیٹی ڈھیلی اور تیس سالہ بھائی جلال شامل ہے جنگ کراچی

(۲۹۔۵۔۵) انہیں آپ ہندو نہ سمجھ لیجئے۔ ایسے ہی ناموں والے ۲۲لاکھ افراد سندھ کے نجی جیلوں میں اسیری کی زندگی گذار رہے ہیں۔

شاید اسی لیے سینٹر کلثوم پروین نے سینٹ میں یہ بیان دیا کہ مختاراں مائی اور ڈاکٹر شازیہ کے معاملات پر ہاہا کار نہ ہونا چاہیے اور مختاراں مائی کو اللہ کی عدالت سے انصاف مانگنا چاہیے۔

روزنامہ ڈان ۱۸۔۶۔۵

(34) آخر نوبت یہ آتی ہے کہ ہندوستان کے عوام اٹھ کھڑے ہوئے (۱۸۵۷ء) مگر سامراج کے ہندوستانی گماشتوں نے انہیں شکست دلوانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تفصیلات اب بہ آسانی دستیاب ہیں (۱۸۵۷ء کے چشم دید واقعات) غداروں کے خطوط، ۔ ہندوستان میں عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو ملا کر انگریز کی تعداد کبھی بھی دس ہزار سے زیادہ نہیں رہی اور ۴۷ء میں اقتدار کے منتقلی کے ساتھ ہی وہ جھاڑ کر رخصت ہو گیا وہ اتنا غیور تھا کہ غلاموں کی ہمسری اسے قبول نہ تھی۔

(35) یہ ذکر ہو چکا ہے کہ لباس صرف غیر ملکی حملہ آور حکمران پہنا کرتے تھے۔ یا اُن کے عاملین جنہیں وہ ہندوستانیوں سے بے گانہ بنانے اور ممتاز کرنے کے لیے لباس پہننے پر مجبور کرتے تھے جس طرح انگریزوں نے انیسویں صدی میں سکھوں کو پگڑی پہنا دی (رسالہ تاریخ۔ ۲۰۰۰ء لاہور)۔ اس لیے یہ خطاب کے ساتھ خلعت پوشاک بھی دی جاتی تھی اس کی تازہ اور آخری مثال مرزا غالب ہیں یعنی نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خان بیگ بہادر نظام جنگ سات پارچہ جیغہ سر پیچ، موتیوں کی مالا، خلعت المتخلص غالب عرف مرزا نوشہ۔ اس سے کوئی سو برس پہلے عبدالصمد خاں جو ۱۷۳۷ء میں لاہور میں مر گیا۔ بادشاہ نے اُس کے انتقال کے بارے میں سننے کے بعد اُس کے بھائی وزیر قمر الدین خاں کو خلعت تعزیت عطا کیا۔ لاہور میں مرحوم

کے اہلِ خانہ نے بادشاہ سے تعزیت کے ملبوسات وصول کیے (صفحہ ۳۹۹) ت۔ پ

(36) بقول ہنٹنگٹن ہم خود کو متعارف کراتے ہوئے وہ شناخت بیان کرتے ہیں جو ہماری پہنچان نہیں ہوتی۔

میں مذہبی نقطۂ نظر بیان کرتا ہوں جب مرد لنگوٹی میں پھرتا ہو تو اسے ستر پوشی پر یہ کہہ کر آمادہ کیا گیا کہ وہ ناف سے لیکر گھٹنوں تک کپڑا لپیٹ کر مسجد میں داخل ہوا کرے اور عورت کے لے رفع یدین کے باوجود یہ ترکیب (شرع) اختیار کی گئی کہ اس سے کہا گیا کہ وہ (عام فہم اور خاص پسند زبان میں) نماز پڑھتے میں سینے کو ڈھانپے جیسا کہ میں ابن بطوطہ اور ٹیپو سلطان کے ذکر میں بتا آیا ہوں ان سے ہماری مسموم رائج زبان میں جس کا دائرہ اثر گردن سے تین انچ نیچے تک رہ گیا تھا اور جو پورے جسم کا زیادہ سے زیادہ چھبیس فیصد بنتا ہے کیسے کہا جاتا کہ پستانوں کو چھپاؤ کیونکہ وہ ان پر کپڑا نہیں ڈالتی تھیں۔ اس لیے شیعوں سمیت جن کے ہاں نماز کے دوران میں ہاتھوں کا پہلو سے لگے رہنا لازمی ہے، تمام فرقوں نے نہایت خاموشی سے اتحاد خمسہ کرلیا جس کے نتیجے میں عورتوں کو ناف سے چھ انچ یا نو انگلی بھر اوپر ہاتھ بندھوا دیے گئے۔ سینے کا لفظ تمام فرقوں کی اردو کی کتابوں میں درج ہے۔ کوئی دو سو برس سے عورتیں گلے میں کپڑے پہننے لگی ہیں مگر وہ پھر بھی ہاتھ باندھے رہتی ہیں۔ یہ صورتحال ۱۹ویں صدی کے وسط میں بھی موجود ہے۔ مرزا شوقؔ سے سنیئے۔

سینے پر دونوں چھاتیاں انمول۔۔۔ اونچی چکنی کراری گول
آڑی ہیکل گلے میں ڈالے ہوئے۔۔۔ پیاری پیاری کچیں نکالے ہوئے۔

انیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں پارسائی اتنی سوار ہوگئی کہ

ع۔ کہا جب اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

یا پھر

ع۔ مال جو اچھا ہے الگ باندھ کر رکھا ہے

(37) خلعت دینے کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے ہمارے اخبارات وزرا کا مذاق اڑانے کے لیے اکثر لکھتے ہین کہ فلاں صاحب آج کل شیروانی کی ناپ دے کر ایوان صدر سے بلاوے کا انتظار کر رہے۔ جیسے بھارت کے جمہوری نظام میں جو انسان کے بنائے ہوئے سیاسی نظاموں میں سب سے کم برا نظام ہے۔ جنوب شمال کے مناقشے کی پردہ پوشی کے لیے وہاں کی مقتدرہ/ اسٹیبلشمنٹ نے ایک دراوڑی شخص دیوگوڑا کو ڈھونڈ نکالا جسے انگریزی محاورے میں ڈارک ہارس کہا جاتا ہے موصوف نے دہلی پہنچتے ہی بھانڈا پھوڑ دیا کہ اگرچہ میں پیشے کے لحاظ سے انجینئر ہوں مگر گھر میں ٹاٹ پر سوتا ہوں اور میرے گھر میں کوئی کھڑکی نہیں ہے۔ بالکل تازہ مثال موجودہ بھارتی صدر ڈاکٹر اول پھکیر جین العابدین عبدالکلام کی ہے جنہیں صدر بننے سے پہلے دہلی میں امرا کے طبقے کے بازار سے چار جوڑ کپڑے سلوا کر دیے گئے تب موصوف نے حلف اٹھایا مگر وہ بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ میں تو گھر پر چپل جوتے نہیں پہنتا۔ جناب مشرقی ساحل کے رہنے والے ہیں۔ آپ جاپان تک چلے جائیں گھر میں جوتے پہنا معیوب یا بدمذاقی سمجھا جاتا ہے۔

(38) اسی طرح ہمارے گھروں کی تعمیرات کا معاملہ ہے جس پر ۱۹۴۷ء تک برطانوی اثر اس لیے نہیں پڑا کیونکہ انگریز کنٹونمنٹ یا سول لائنز میں رہتا تھا اور اپنے مذاق کے مطابق گھر/ دفاتر/ بنواتا تھا۔ یوں ہماری تعمیراتی روایات میں زیادہ فرق نہ آیا۔ ہمارے گھروں کی چھتیں عموماً کافی اونچی ہوتی تھیں تاکہ گرمی کم ہو اور کمرے اس لیے نہیں بنائے جاتے تھے کیونکہ چودنا کوئی گناہ نہ تھا اور کھڑکیوں کی روایت نہ ہونے کی وجہ سے (زیڈ۔ اے بخاری کی سرگزشت مطبوعہ روزنامہ حُریت ۱۹۶۳ء کراچی) دالان بے در کے بنائے جاتے تھے۔ جس میں برسات اور گرمی

میں زیادہ فرحت ملتی۔ اسی طرح اکثر گھروں میں نہانے کے لیے بیسویں صدی میں بھی مرد لنگوٹ باندھ کر نہا لیتے اور عورتیں چارپائی کھڑی کر کے نہایا کرتیں۔ مغلوں کے عہد میں غلسخانہ کچن کیبنٹ یا مقرب وزراء کے اجلاس کے مقام کو کہتے تھے۔ پنجاب کے شہر میں گھروں کی چھت پر ٹٹی (پنجابی زبان میں) ہوا کرتی۔ یوپی اور پنجاب کے دیہات میں لوگ کھیت پر جاتے اور آبدست کی جگہ گھیسی کا رواج تھا یا جیسے آج تک شمال مغربی سرحدی صوبے میں پتھر ڈھیلے کا چلن ہے۔ یورپ کی نقالی میں اب نہ کوئی مگنے جاتا ہے یا (پاخانہ پھرنے) نہ کوئی موتنے یا پیشاب کرنے جاتا ہے بلکہ سب لوگ ٹوائلٹ جاتے ہیں باتھ روم، واش روم جاتے ہیں۔ اپنی زبان میں نہ تو اب کوئی پاخانے جاتا ہے نہ بیت الخلا یہ دونوں الفاظ بالترتیب فارسی اور عربی سے لیے گئے ہیں زبان میں یہ خلا غالباً اس لیے پیدا ہوا ہے کیونکہ ہم نے بنیادی ضرورتوں کے لفظوں کی تطہیر کر دی۔ نام نہاد تعلیم یافتہ طبقہ اس خلا کو انگریزی کے لفظوں سے پورا کرتا ہے۔ میں انہیں الزام نہیں دیتا یہ لسانی تاریخ کا جبر ہے۔ تاہم آبِ حیات کو چھوڑ کر تمام چرند و پرند چاہے حرام ہوں یا حلال استنجے اور آبدست کے بغیر بے فکری کی زندگی گزارتے ہیں۔ پلاسی کی جنگ سے پہلے لوگ نہ جانے کیا کرتے ہوں گے شاید عریاںؔ یا چرکینؔ کے کلام میں اس کا کوئی حل موجود ہو۔

(39) اب زبان کی تطہیر سے پہنچنے والے نقصانات کا جائزہ لینا ہوگا۔ تخلیق اختراع اور اپج بچوں میں بہت ہوتی ہے اور ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے جب تک ہماری نام نہاد تعلیم کے ذریعے انہیں کند ذہن اور رہٹ دھرم نہ بنا دیا جائے۔ اس کی مثال میں پیش کرتا ہوں۔ ایک گھر کا فوارہ خراب ہو گیا تھا وہاں نہانے کے لیے بالٹی بھر پانی رکھ دیا گیا لڑکا بھاگتا ہوا باہر نکلا اور اہل خانہ کے سامنے مچلنے لگا کہ میں تو بارش میں نہاؤں گا۔ اسی طرح ایک پانچ چھ برس کی بچی روتی ہوئی پاخانے سے نکلی پوچھا گیا

کہ کیوں روتی ہوتو جواب میں کہنے لگی کہ مجھے چوٹ لگ گئی ہے مزید استفسار پر بتانے لگی کہ اس جگہ پر جہاں سے میں پیشاب کرتی ہوں اسے کسی نے بتایا ہی نہ تھا کہ جسم کے اس عضو کو کیا کہا جاتا ہے۔ اسی طرح میں کسی ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر جارہا تھا اور میرے آگے تین نوجوان باتیں کرتے ہوئے چلے جارہے تھے۔ ان تینوں میں سے ایک نے مخاطب کرنے کے لیے ''تم'' کہا مگر بات شروع نہ کرسکا باقی دوستوں نے کچھ اور بات نکال لی اس نے بات کا آغاز کرنے کے واسطے دوبارہ تم کہا مگر پھر بات کٹ گئی ذرا سے وقفے کے بعد تیسری مرتبہ پھر زور سے تم کہا تو اس کا دوسرا ساتھی بولا ابے کب تک ستار بجائے جائے گا مادر چود کچھ بولے گا بھی۔ اسی طرح ایک عدالت میں ایک جماع بالجبر کی ماری دیہاتی عورت سے وکیل صفائی نے یہ پوچھا کہ تمہاری چوت میں جب ڈفو گھسا تو کیسا لگا۔ پہلے تو وہ چپ رہی مگر عدالت کے مجبور کرنے پر کہنے لگی یہ کیا پوچھتے ہو شکر خوشی سے کھاؤ یا زور سے کھلاؤ وہ میٹھی ہی لگے گی۔ (بہ زبان پوربیا)۔ اسی طرح میری کثیر العیال پنجابن دوست سے دوستوں نے پوچھا کہ آپ نے چھ بچے کیسے جن دیئے آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوتی، تو کہنے لگیں اے کڑی گل اے (لمی ساں لینی آں ہور کڈ دینی آں) یعنی لمبی سانس لے کر نکال باہر کرتی ہوں۔

(40) اب دیکھئے ایسی خلاقی اور تخلیقی صلاحتیں ہماری تسنیم و کوثر کی دھلی ہوئی زبان اور چند سولغت نویسوں شاعروں اور نثر نگاروں کی اخلاقی پسند و ناپسند کی بھینٹ چڑھ چکی ہے۔ جیسے اہل حجاز غیر ملکیوں کو عجمی (گونگا) کہا کرتے تھے ویسے ہی ہماری لسانی اشرافیہ نے جو ہر نئی ترکیب اور نئے لفظ کے استعمال پر حوالہ طلب کر لیتے ہیں اپنے غیر ملکی آقاؤں اور اب موجودہ مقتدرہ کو رام کرنے کے لیے اور مراعات حاصل کرنے کے لیے برصغیر کی پچانوے فیصد آبادی کو کوئی دوسو برس سے عجمی بنائے ہوئے ہیں۔ اور یہی زبان ریڈیو، اخبارات اور ٹی وی پر مزید باریک چھلنی

سے گزار کر استعمال کی جارہی ہے۔ یہاں پر جوشؔ جیسے روایت شکن اور قادرالکلام شاعر کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ لاشعوری طور پر وہ زبان کے معاملے میں لفظوں کے صوتی اثرات کی بھی گرفت کر لیتے اپنی سوانح عمری، یادوں کی بارات میں اقبال کے ایک مصرعہ کا مذاق اڑانے کے لے قاضی خورشید کے منہ سے کہلاتے ہیں۔

کبھی قبلہ رخ جو کھڑا ہوا تو حرم سے آنے لگی صدا ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

اور تبصرہ کرتے ہیں کہ مصرعہ اول کے جزو اول میں ''کبھی قبلہ رخ جو کھڑا ہوا'' میں ایک ایسی فحاشی اور بدتمیزی کی گئی ہے جس کو میں زبان پر نہیں لاسکتا، توبہ توبہ کھڑا ہوا۔ ایسی فحاشی معاذ اللہ۔ میرا اعتراض جوشؔ پر نہیں ہے بلکہ مذکورہ سکہ بند روایت کے تسلسل کا بیان مقصود ہے۔

(41) ارتقا کے ۳۴ویں شمارے کے ''زبان کا زخم'' کے مضمون سے میں اسی روایت کی ایک تحریر سنانا چاہتا ہوں ''وہ شعرا جو دربار میں بار پاتے تھے اور جن مین سے بیشتر کا روزگار ہی سلاطین نوابین اور امرا سے وابستہ تھا انہوں نے امرد پرستی، طوائف گردی اور جنس پرستی کے معاملات کو بلاکم و کاست بیان کرنا اپنا ہنر جانا، نتیجے کے طور پر زبان کے خنجر سے ہر اعلیٰ اور شایستہ قدر ذبح

ہوئی اور بوالہوسی کو عشق کا نام دیا گیا۔۔۔شعروادب کی اقلیم کے بیشتر سربراوردہ شاعروں نے عورت کے بدن سے قصابوں کا سلوک کیا۔'' اگر آپ ذرا سی توجہ سے کام لیں تو پتہ چل جائے گا کہ خورشید اسلام جن کی یہ تحریر ہے ابھی ابھی کسی مدرسے سے فارغ التحصیل ہوکر نکلے ہیں اور امرد پرستی طوائف گردی کو ختم کرنے پر جہاد کرنے کے لیے کمربستہ ہیں۔ کیونکہ ایسے حضرات، مذاہب اور علم الاخلاق میں جو اکثر تبدیلی کی زد پر رہتے ہیں تمیز کرنے سے قاصر ہیں۔

(42) گذشتہ سال ۲۰۰۴ء جون کا قصہ سناتا ہوں جب میں ٹورنٹو میں متنوع تہذیبوں کے میلے میں شریک ہوا۔ توجہ فرمایئے آج کینڈا کی فی کس آمدنی ۲۴ ہزار ڈالر سالانہ سے اُوپر ہے۔ متنوع تہذیبوں کے اس میلے میں سینکڑوں مرد بغیر کسی لباس کے شریک تھے اور درجنوں نوجوان عورتیں صرف چڈی پہنے ہوئے تھیں۔ جبکہ اسی میلے میں پوپ کو ایڈز پھیلانے کا خدائی خدمتگار ٹھہرایا جا رہا تھا۔ اینگلیکن چرچ نے کاروبار کے بند ہو جانے کے اندیشے سے یہ اعلان کر دیا تھا کہ ہمارے سارے گرجے امرد پرستوں، چپٹی کھیلنے والیوں اور مخنثوں کا خیر مقدم کرتے ہیں تو کیا یہ ابتذال اور فحاشی کی نشانیاں ہیں؟

(43) غربت زندگی میں بے بسی اور بوریت لاتی ہے اور خوشحالی قوت عمل رنگا رنگی اور نو بہ نو ایوان کھولتی ہے، لوگوں میں حرکت پذیری پیدا ہوتی ہے ایلون ٹافلر فیوچر شاک میں کہتا ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد بیس مرد و زن کو کھانے کی دعوت میں بلانے کے لیے چالیس افراد کو دعوت نامے جاری کئے جاتے تھے اور اب اتنے ہی افراد کو بلانے کے لیے سو افراد کو مدعو کرنا پڑتا ہے کیونکہ خوشحالی اور بوئنگ طیارے کی وجہ سے سفر محفوظ اور تیز رفتار ہو چکا ہے اور خوشحال لوگ لند ن میں کم ہی رہتے ہیں۔ (اسی لیے ہم سب یہاں جمع ہیں)

(44) روزمرہ زندگی میں اس خواص پسند زبان کو ایک مخصوص اقلیت بولتی ہے اور جب ہم سودا سلف لینے جاتے ہیں تو استحصالی اور مظلوم طبقات کی جدلیات سر اٹھا لیتی ہے۔ خواندگی کی کمی کے سبب اشیائے ضرورت پر قیمتیں نہیں درج ہوتیں اس لیے ٹھیلے والے اور پھیری لگانے والے گاہک کی آواز سے پہچان جاتے ہیں کہ گاہک ایک نام نہاد طبقے کا رکن ہے اور فوراً بازار کے نرخ کے مقابلے میں زیادہ قیمت بتا دیتا ہے اور اس کے بعد خوشامد چاپلوسی پر اُتر آتا ہے اور کہتا ہے آپ کے لیے مطلب ہے آپ کے لیے رعایت دے رہا ہوں اس کے برعکس اگر ان ہی کے لہجے

میں گفتگو کرنے والا خریدار آ جائے تو بازار کے نرخوں پر سودا بیچا جاتا ہے۔

(45) اس کمزوری یا حقیقت حال کا چند سیاستدانوں نے نہایت کامیابی سے استعمال کیا اور اپنی مقبولیت میں اضافہ کیا خواص پسند زبان کے نمائندے پنڈت نہرو اور نواب زادہ نصر اللہ خان تھے جبکہ خوانچے والے اور لوہار، تیلی اور گوالے کی زبان کبھی کبھی ذوالفقار علی بھٹو استعمال کرتے جیسا کہ انہوں نے ۱۹۷۲ء میں لاہور کے قذافی اسٹیڈیم میں خطاب کرتے ہوئے ایک لاکھ سے زیادہ مجمع میں استحصالی طبقے کو بہن چود کہا اور یہ جملے ریڈیو پر نشر ہوتے رہے مگر جلسہ عام فلک شگاف نعروں سے گونجنے لگا اور بھٹو کو چند منٹ کے لیے تقریر روکنا پڑی اور کہنا پڑا کہ میں جذبات میں آ گیا اسے کٹ کرو کٹ مگر اب پچھتائے کیا ہوت جب

چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ اسی طرح بھارت میں للو پرساد یادیو نے یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود پرجا کا لہجہ اختیار کر لیا ہے اپنے طبقے کی زبان ممکن ہے وہ اہل خانہ سے بولتے ہوں۔ انہوں نے پاکستانی TV پر یہ تک کہہ دیا کہ پہلے ہم جانور/مویشی چراتے تھے اور ایک گائے نے ہمارے پاؤں کا انگوٹھا کچل ڈالا آج کل ہم آدمیوں کو چراتے ہیں اور ان کے دانہ پانی کا بندوبست کرتے ہیں (میں یہاں ان کے لہجے کی نقل کرنے سے قاصر ہوں) لیکن ان کے لب و لہجے کا اثر دیکھیے کہ کسی بھی حلقے سے کسی احتجاج کی آواز نہیں بلند ہوئی۔ پرجا کی زبان کیا ہے کیا وہ کسی اور دنیا کی مخلوق ہیں؟ ہندوستان/پاکستان کی زبانوں اردو/ہندوستانی/ہندی کو چاہے جس نام سے پکاریں اسے ان ہی لوگوں پر چھوڑ دیں جو لکھنا نہیں جانتے۔ برصغیر میں اتحاد کے لیے یہ معمولی سی قیمت ہے۔ ملکوں کے نام تین رہیں یا تیرہ یا پھر سب کو لکھنا سکھا دیں میری اس تجویز کو اخباری زبان میں گذشتہ پچاس برس سے ایک اور پیرائے میں دہرایا جا رہا ہے۔ کہ عوام تو محبت اور بھائی چارہ چاہتے ہیں دونوں طرف کے سیاستدان دشمنی کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ یہاں

سیاستدانوں سے مراد یہی مخصوص طبقہ ہے جو لغت کی اردو انگریزی یا ہندی بولتا ہے۔ امکان یہ ہے کہ عوام سو دو برس میں بالا دست طبقات کی زبان قتل کر دیں گے جیسا کہ وہ یونانی، ترکی، عربی اور فارسی بولنے والے حملہ آور ڈاکوؤں کی زبانوں کا حشر کر چکے ہیں اور جس کا آغاز بنگلہ دیش میں ہو بھی چکا ہے۔

(46) مقتدرہ نشاط دشمن نہیں ہوتی مگر یہ چاہتی ہے کہ جشن طرب و کیف صرف پوشیدہ مقامات پر برپا ہوں کہیں سب ہی اس کا تقاضہ نہ کرنے لگیں۔ مروجہ تعلیم منافقانہ اور مریضانہ پردہ پوشی کو فروغ دیتی ہے اور طبقات کو جنم دیتی ہے۔

(47) ہم حرف شناسی کے نام پر منافقانہ پارسائی کے آہنی خوا میں سے کب نکلیں گے بقول جارج اورول حوالہ ملاحظہ کیجیے One of the Effects of Safe Civilized life is an immense over Sensitiveness that makes all the primary Emotions Seen Some what Disgusting اس کا ترجمہ کچھ یوں ہے۔ ''مہذب اور پر آفیت زندگی کے بد اثرات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ہمیں فطری تقاضوں کے معاملے میں بے حد حساس بنا دیتی ہے جس سے انسان کے فطری ولولے نفرت انگیز معلوم ہونے لگتے ہیں'' آیئے ہم خواص پسند زبان سے سماج پر پڑنے والے بد اثرات کا جائزہ لیتے ہیں راتج زبان عہد حاضر کے ٹھوس حقائق کو بیان کرنے میں عاجز ہے۔ اس کے دو نمونے ملاحظہ کیجیے پہلے منفی صورتحال۔ پاکستان میں آپا مختاراں مائی کا واقعہ جس میں ایک قبیلے کی پنچایت نے نسیم اختر المعروف مختاراں مائی کے ایک بھائی کے کسی کنواری عورت سے بغیر شادی کے مبینہ جنسی تعلقات کا بدلہ لینے کی غرض سے آنکھ کا بدلہ آنکھ کے اصول پر عدل جہانگیری کے تحت لڑکی کے قبیلے کے چار مردوں کو اجازت دی کہ وہ عدالت کے حاطے میں مطلقہ مختاراں

مائی کو یکے بعد دیگرے چودیں۔ یہ کاروائی کوئی دو گھنٹے میں مکمل ہوئی۔ یہ واقعہ بین الاقوامی پریس میں شہ سرخیوں میں چھپا اور عالمی ٹی وی نے بھی بیان کیا مگر ہماری پیاری زبان میں اس طویل کاروائی کی تفصیلات کو صرف نو الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے حوالہ شروع ''مختاراں کے ساتھ مستوی قبیلے کے نوجوان زیادتی کریں گے'' حوالہ ختم اگر نام نکال دیا جائے تو کل کاروائی بیان کرنے کے لیے محض نو

لفظوں کا استعمال کیا گیا۔

اب مثبت صورتحال دیکھئے بنکاک کے لاتعداد شبینہ کلبوں میں ہر رات یہ تماشہ ہوتا ہے جس کا ٹکٹ بمشکل دو ڈھائی سو روپے ہوتا ہے خواتین اور مرد تماشایوں کی موجودگی میں دس بارہ خواتین آتی ہیں جو مادرزاد ننگی ہوتی ہیں مگر پیروں میں صرف اونچی ایڑی کی سینڈل ہوتی ہے۔ اس کے بعد دو مرد ننگ دھڑنگ داخل ہوتے ہیں اور تماشایوں کی پسند پوچھ کر مرد کسی لڑکی سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے تک گاید (یہ لفظ اس لیے آپ میں سے زیادہ کے لے اجنبی ہے کیونکہ صرف لغت میں ملتا ہے) کرتا ہے جس کے معنی الف سے لے کر ے تک چودنے کی تمام تفصیلات۔

برصغیر میں زبان اور لسانیات کی اس نوآبادیاتی نظام کی تیار کردہ آہنی خول کو ہٹانے اور پاش پاش کرنے کے لیے اتنی ہی فکری قوت اور توانائی کی ضرورت ہے جتنی خلا میں داخل ہونے اور فضا کی غیر مرئی حدود کو توڑنے کے لیے درکار ہوتی ہے یعنی سات کلومیٹر فی سیکنڈ یا ۲۷ ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ اس کے علاوہ آپ کے سفر کا زاویہ بھی درست ہونا چاہیے۔

(48) اس جملہ معترضہ کی معافی چاہتا ہوں۔ گذشتہ ستاون برس میں اگرچہ چند لسانی اصلاحات دیکھنے میں آئی ہیں جیسے لفظ ''تو'' قریب قریب متروک ہو چکا ہے مگر آپ اور تم کا چلن اب سماجی تقسیم کو گہرا کر رہا ہے یعنی آپ سے مراد خاص پسند ہے۔ اسی طرح آپ اردو کی کسی لغت

پر سرسری نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ یہاں لفظ کی اخلاقی تعریف ضرور متعین کی جاتی ہے ماہریں لسانیات نے اخلاقی اور مابعد الطبیعاتی مسائل کے فرائض کیوں سنبھال لیے؟ اور وہ ہر لفظ کی صفات فحش، غلط العوام، سوقیانہ بازاری، مبتذل بیگماتی اور عوامی بیان کرتے ہیں اور اس طرح دنیا سے گزر جانے والے اور زندہ اکثریت کی تحقیر کرتے رہتے ہیں جو ہماری زبان یا زبانوں کے خالق اور پرورش کرنے والے ہیں۔

(49) میں نے اس تحریر میں سکھوں، جین، مسلموں، مسیحوں اور بدھ مت کے جاننے والوں کا نام لے کر ذکر کیا ہے مگر اکثریت کا ذکر اس لیے کم کیا ہے کیونکہ ان کی نمائندہ پوجا بھٹ نے پاکستان ٹی وی پر ایک سوال کے جواب میں یہ کہہ کر مسئلہ حل کر دیا کہ آپ بھارتی فلموں میں عریانی/فحاشی اور OBSENITY کے متعلق کیا کہتی ہیں جس کا تعلق صرف نسوانی جسم سے ہے تو انہوں نے کہا کہ یہ تمام مسائل مغرب یا ویسٹ جس میں جاپان بھی شامل ہے کے ہیں ہماری تو تمام صنمیات بے لباس ہے۔

(50) کینڈا میں نومبر 2000 میں ہونے والے ایک سروے میں کہا گیا جس میں ۱۵ سے ۴۵ برس کی عمر کی ہزاروں خواتین سے 'جنس کرنے' سے متعلق سوالات پوچھے گئے جس میں آدھی سے زیادہ خواتین نے جواب دیا کہ ہم چاہتے ہیں کہ جنس کاری سر راہ، فٹ پاتھ، پارکوں اور عوامی جگہوں پر ہو۔ یہ نتائج ریڈیو ۶۸۰ پر نشر کیے گئے اسی طرح امریکہ میں ایک سروے سے ظاہر ہوا کہ امریکی عورت سب سے زیادہ تشدد کا نشانہ اپنے بوائے فرینڈ یا شوہر کے کمرے میں بنتی ہے۔ جبکہ کینیڈین رپورٹ کے مطابق پاکستان میں 99 فیصد خواتین زدوکوب کی جاتی ہیں۔

مغرب کیا ہماری محنت کش قوت کو کسی جذبہ خیر سگالی سے آنے دے رہا ہے اس کی وجہ ویلفیر ریاست ایک فرد ایک ووٹ اور

مغرب کی عورت میں بڑھتا ہوا احساس تحفظ ہے جس کی وجہ سے اس نے بیگار اور فورسڈ لیبر یعنی بچے جننے اور پرورش کرنے سے تقریباً انکار کر دیا ہے۔ کیا یہ سب فحاشی اور بے راہ روی میں شمار ہوگا۔ کینڈا کی حکومت نے وضع حمل کے لیے مع تنخواہ کے ایک سال کی چھٹی کا قانون جب پارلیمنٹ سے منظور کرایا تو خواتین کی انجمن کی صدر نے یہ کہہ کر اسے مسترد کر دیا کہ ہمیں حکومت اس طرح ترغیب نہ دے اگر اسے بچوں کا اتنا ہی شوق ہے تو وزیر اعظم خود بچے جنا کرے۔
مغرب میں عورت سال بھر کا معاوضہ لے کر بھی قومی ریاست (N.S) کی اقتصادی کل اور توپ کے لیے چارہ تیار کر کے دینے کو آمادہ نہیں ہے۔ یہ ایک فرد ایک ووٹ اور سوشل ویلفیر کے طفیل ممکن ہوا ہے۔

(51) یہ کوئی اتفاق یا حادثہ نہیں تھا جب پہلی عالمگیر جنگ کے خاتمے پر اٹھارویں صدی کے وسط میں شروع ہونے والے صنعتی دور کے ایک سو ستر سال کے بعد برطانوی عورت کو ۱۹۲۱ء میں ووٹ ڈالنے کا حق ملا یہ وہ وقت تھا جب برطانیہ روے زمین کے ۸۳ فیصد حصے پر قابض تھا اور اس پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا اور یہی وہ سال ہے۔ ذرا سے مجھے موضوع سے ہٹنے کی اجازت دیجیے۔ یہ بھی آج تک ساری دنیا میں دستور جلد آ رہا ہے کہ فوجی قوت کو ظاہر کرنے کے لیے مسلح دستوں کی پریڈیں کی جاتی ہیں جو مکے کی طاقت کی مظہر ہوتیں ہیں اور جنہیں ہزاروں سال سے کبھی فحاشی نہیں کہا گیا اس زنانہ ووٹوں کے سال میں صنعتی ملک امریکہ کے شہر اٹلانٹک سٹی میں چڈی اور انگیہ میں ملبوس عورتوں کا مقابلہ حسن پہلی مرتبہ منعقد ہوتا ہے جو سر عام ٹٹنے کی قوت منوانے کا نکتہ آغاز ہے۔ مزید براں پانچ سال کے بعد انسداد تشنج کی دوا ایجاد ہوتی ہے۔ اگر ہم دو جنگوں کے درمیانی مدت کو جو ہتھیاروں کی تیاری فوجی تربیت کا زمانہ ہوتا ہے اسے امن کہیں تو دوسری سی سالہ جنگ کے بعد ۱۹۴۵ میں یہ دوا غیر فوجی آبادی کو دستیاب ہونے لگتی ہے۔ اٹھارویں

صدی کے مالتھس کے بقول دبائیں اور جنگیں اضافہ آبادی پر چیک رکھتی ہیں اور وہ کبھی جیومٹری کے حساب سے نہیں بڑھنے پاتی اگر اس کی مزید تفصیلات پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ بالغ مردوں کو جنگیں ہڑپ کر جاتی تھیں اور عورتوں کی تعداد کو زچگی کم کرتی رہتی تھی اس دوا سے زچگی میں عورتوں کی شرح اموات کو کم کرنے میں ۹۹٫۹ ٪ تک کامیابی حاصل کی جا چکی ہے۔ یوں دنیا کی آبادی گذشتہ آدھی صدی میں دگنی ہوگئی۔

مغرب میں جہاں مردوں اور عورتوں کو تعلیم اور صحت کے تقریباً مساوی مواقع میسر ہیں وہاں عورتیں مقابلتاً دس فیصد زیادہ عمر پاتی ہیں۔ یوں ۲۰۴۰ء تک عورتوں اور مردوں کا عالمی تناسب ۵۵:۴۵ ہو جائیگا اور اگر نکاح کا رواج رہ بھی گیا تو نکاح نامے میں ایک شق کا اضافہ کرنا پڑے گا کہ ولدیت طے کرنے کے لیے ڈی این اے ٹیسٹ نہیں کرایا جائے گا۔ یوں خاندان یا دولت کی سلطنت یا ایمپائر منہدم ہونے لگے گی۔ اورنیشن اسٹیٹ کا کلیدی پتھر یعنی کنبے کی اکائی ہل جائے گی جیسا کہ یورپی یونین میں دیکھنے میں آرہا ہے۔ تب ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ مُلّے اور اس کے حریف ٹنے میں سے کون طاقتور اور حیات آفرین ہے۔ اس کے بعد نوع انسان سرمایہ داری کے عفریت کو لگام دے سکے گا۔

(52) ۱۹۸۰ سے یہی جنگ مختلف ناموں سے لڑی جارہی ہے مذہب کی تعداد کے لحاظ سے سب سے بڑی انجمن جن کی

تعداد ایک ارب سے زیادہ ہے ان کے نمائندے کے حالیہ انتخاب کے لیے ۱۱۸ افراد پر مشتمل انتخابی کالج میں کوئی عورت شامل نہ تھی۔ جبکہ مدر ٹریسا کو چند سال پہلے قدیم ضابطوں کو نظر انداز کر کے پوپ پال دوم نے اپنے آمرانہ اختیارات استعمال کرتے ہوئے ولیہ کے جلیل مرتبے پر فائز کر دیا تھا۔ اسی طرح عمر کے لحاظ سے جونیر مذہب جس میں میری پیدائش اور

پرورش ہوئی ہے وہ عورت کی امامت روکنے پر پوری قوت صرف کر رہا ہے اور بھارت میں نکاح کے مجوزہ فارم میں حالیہ ترمیم کے ذریعے ولی کو مصالحت کنندہ کے نام پر چور دروازے سے داخل کرنے کی کوشش کی گئی ہے (جنگ ۳ مئی ۲۰۰۵ء) ساتھ ہی ساتھ بھارت میں ایک عورت کو کئی شوہر کرنے کا بل لوک سبھا میں منظوری کا منتظر ہے اور عوامی جمہوریہ چین میں جو انسانی آبادی کے اکیس فیصد کا ملک ہے وہاں متعدد صوبوں میں خواتین کو بغیر شوہر کے بچے جننے کا حق مل چکا ہے۔

(53) جب انگریز ۱۹۴۷ میں رخصت ہو رہا تھا اس وقت ہماری اوسط عمر ۲۷ سال تھی جو بقول ابراہیم جلیس چالیس کروڑ بھکاریوں پر مشتمل تھی۔ اور آج پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش میں اوسط عمر ۶۰ برس سے اوپر ہے جو ہماری محدود آزادی کا کرشمہ ہے۔ بھارت میں آخری قحط ۷۲ء میں بنگلہ دیش میں سال ۷۴ء میں اور مغربی پاکستان میں ۱۹۵۳ء میں پڑا تھا۔ تینوں علاقوں کے لوگوں کی صحتوں میں فرق صاف ظاہر ہے۔ جبکہ سویڈن اور جاپان میں اوسط عمر بالترتیب ۸۰/۸۳ برس ہے۔

(54) اب آپ ہی بتایئے 1947-1764 یعنی کوی پونے دو سو سال کے دوران میں جب ہر سولہ سال بعد قحط سالی اور فاقہ کشی کی شکار آبادی (جس کی تفصیل آگے آتی ہے) جس میں عورت کو خوراک سب کے آخر میں اور سب سے کم ملنے کی وجہ سے جنوبی ایشیا کی خواتین کی اکثریت خون کی کمی کا شکار ہوں جس کی وجہ سے فعل مختار سے محروم ہو گئی ہوں تو وہ جن بچوں کو جنم دیں گی وہ کتنے کمزور اور لاغر ہونگے۔ ۴۷ء تک پیدا ہونے والے ہر سو بچوں میں سے ۶۷ بچے پانچویں سالگرہ سے پہلے مر جاتے تھے۔ اسی وجہ سے برصغیر میں بچپنے کی شادی کا رواج ہوا۔ اس وقت کی اوسط عمر میں پہلے ہی بتا چکا ہوں یعنی ۲۷ سال۔ ان اموات کی سب سے بڑی اور اہم وجہ سوکھے کی بیماری یا (بچوں کی TB) تھی۔ اس عرصے میں ڈھائی کروڑ افراد کی قحط کی وجہ سے

اموات کے علاوہ کم سنی کی اموات کا ہمارے پاس کوئی کھاتہ نہیں ہے ایک محتاط تخمینے کے مطابق ۱۹۰۱ سے ۱۹۴۰ تک تیس کروڑ بچے چھٹی سالگرہ نہ دیکھ پائے۔

(55) اس کے نتیجے میں ہم پستہ قامت لاتعلق اور بے حس ہوتے چلے گئے فکری کجی پیدا ہوگئی اور ذہنیت مریضانہ ہوگئی۔ تخلیق اور کرتبی جستجو کی جگہ نقالی اور تقلید لیتی چلی گئی کیونکہ ہمیں پاکستانی گجرات کے شاہ دولہ کے چوہے بنے ہوئے کوئی دوسو سال ہو چکے ہیں۔ ہم پر مر جانے کا خطرہ ہر وقت طاری رہتا تھا جس قوم کا ہر فرد فاقہ کشی کے سائے میں پرورش پا رہا ہو وہ کیا تخلیق کر سکے گا اور یوں ہماری بچی کھچی توانائی عاقبت سنوارنے میں لگ گئی۔ اور ہمارا تکیہ کلام یہ ہوگیا کہ ہم بری جگہ میں ہیں اور مرنے والے اچھی جگہ پر ہیں۔ یا پھر

ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے۔۔۔ بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہے روٹیاں

(56) میں اس کی وجوہ نہیں تلاش کر سکا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی یا انگریز اتنے سبز قدم کیوں تھے ۔ یہ بات وثوق سے تو نہیں کہی جا سکتی کہ سرمایہ داری اپنے ابتدائی برسوں میں قحط ضرور پیدا کرتی ہے کیوں کہ انگلستان اور آئرلینڈ میں بھی ۱۷۳۹ میں قحط پڑا تھا جس میں ہزاروں لوگوں کی جانیں چلی گئیں (مکالمات برکلے۔ مترجم عبدالباری ندوی کراچی ۲۰۰۴ء) اہل برطانیہ کی آمد سے ہندوستان ویران ہوتا چلا گیا اور انسانی تاریخ میں شاید ہی کہیں ایسی تباہ کن اور ہولناک دو صدیاں گزری ہوں جس میں سائنسی ترقی کے سائے میں کئی کروڑ جانیں چلی گئی ہوں۔ یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ میری تحریر ان واقعات کی تفصیل دینے سے قاصر ہے بلکہ یہ سب کچھ مبہم سے اشارے ہیں، حقائق اس سے زیادہ دلخراش ہونگے۔

(57) سترھویں اور اٹھارویں صدی میں سامراج نے افریقہ سے ڈھائی کروڑ جوان مغربی افریقہ کے راستے شمالی امریکہ پہنچائے مگر ہندوستان پر قیامت ٹوٹ پڑی یا تو ۱۳۹۲ء میں پیر محمد

اور تیمور لنگ کے ۱۳۹۶ سے ۱۴۰۷ء حملوں کے نتیجے میں درگا دیوی کا قحط پڑا جو بارہ برس تک جاری رہا اور آدم خوری کی نوبت آ گئی اور دس لاکھ نفوس ہلاک ہو گئے۔ یا پھر ۷۰۔۱۷۶۹ میں پونے چار سو برس کے بعد قحط پڑتا ہے جو ۱۷۶۴ء میں شاہ عالم ثانی کے بنگال بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کمپنی کو چھبیس لاکھ روپے کے عوض فروخت کرنے کے بعد ہوا جس میں ایک کروڑ افراد ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد لاتعداد سال بھر سے کم مدت والے قحطوں کے علاوہ ۱۹۴۲ء تک نو اور بڑے قحط پڑے یعنی (1783 میں چلیسہ قحط لاہور اور جموں ایک لاکھ ہلاکتیں اور کشمیریوں کی بڑی ہجرت جس کا شاخسانہ کشمیر کا تنازعہ ہے) (94/1790 دو جی بارہ یا کھوپڑی والا قحط جس کی یادگار موری دروازہ ہے) (1838ء شمالی مغربی صوبے یا یو پی جس میں 8 لاکھ ہلاکتیں) (۱۸۶۱ء میں شمال مغربی ہند میں 5 لاکھ اموات) (۱۸۶۶ء اڑیسہ بنگال دس لاکھ جانیں) (1869ء۔ راجپوتانہ شمالی ہند پندرہ لاکھ اموت) پھر (1876ء وسطی مغربی ہند پچاس لاکھ جانیں گئیں) (1897ء) (1899-1901 دس لاکھ اموات جس میں آدم خوری بھی ہوئی) اور آخر میں (۱۹۴۲ء میں بنگال جس میں بیس لاکھ لوگ ہلاک ہوئے۔ مجید شیخ ڈان 5-10-2003) یوں اوسطاً ہر ساڑھے پندرہ سال کے بعد ہندوستان قحط کے چنگل میں آ جاتا اور ہماری نسلیں خوف و دہشت میں مبتلا ہوتی گئیں۔ اور ان کی نفسیات اسی میں ڈھل گئی۔

(57-B) یہ اسی نفسیاتی عارضے کا کمال ہے کہ ہم پنج ستارہ ہوٹلوں میں بھی آج تک نام نہاد معززین کو کھانا چھینتے اور ضائع کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یوں سترھویں اور اٹھارویں صدی میں افریقہ سے ڈھائی کروڑ نوجوان مردوں، عورتوں کی چوری اور شمالی امریکہ پہنچانے کی داستان برصغیر کی تباہی اور بربادی کے سامنے ایک افسانہ لگتی ہے۔

(58) میں قحط سے کسی خطے کے انسانوں پر پڑنے والے اثرات کا کوئی تحقیقی جائزہ تو نہیں

تلاش کر سکا مگر فرد پر قحط کے اثر کا ایک مختصر سا جائزہ پیش کرتا ہوں۔

حوالہ شروع۔ کوئی بھی جان لیوا تجربہ انسانی نفسیات پر کوئی نہ کوئی مستقل اثر ضرور چھوڑتا ہے، چاہے یہ دکھائی دے یا نہ دکھائی دے لیکن یہ لاشعور میں نقش ہو جاتا ہے۔ قحط چونکہ زندگی پر ایک مستقل لٹکتی ہوئی تلوار ہے (جو اچانک دہشت پیدا ہونے کے بعد

پیدا ہونے والے فشار سے جنم لینے والے امراض کا سبب بنتا ہے) جسے P.T.S.D کہا جاتا ہے جس کی علامات بڑھتی ہوئی تشویش اضمحال اور ذات میں تبدیلی ہوتا ہے۔ دیگر علامات میں ڈراونے خواب اور ماضی کا بار بار کوندنا ہے۔ اس کا علاج کوئی ماہر طبیب بجلی کے جھٹکوں اور ادویہ ہی سے کر سکتا ہے (ماہر نفسیات ڈاکٹر رضوان علی مقیم امریکہ) حوالہ ختم۔ اس سلسلے میں ترک ادیبہ خالدہ ادیب خانم کے ۱۹۳۵ء کے سفر نامے میں ہندوستانیوں کی کسمپرسی کا حال سنیئے۔

حوالہ شروع مسٹر وسیم نے مجھ سے کہا کہ ''مجھے ان زمینوں سے کچھ آمدنی نہیں ہوتی اور اگر شہر میں میری جائیداد اور اتنی کامیاب وکالت نہ ہوتی تو سارا کنبہ بھوکا قلاش رہ جاتا۔'' اس وقت میں یہ نہ سمجھ سکی کہ ایک زمیندار کو اپنی زمین سے کچھ آمدنی کیوں نہیں حاصل ہوتی اور اسی سلسلے میں مجھے لکھنؤ کے قریب چند گاؤں دیکھنے کا موقع ملا، کیونکہ مجھ سے کہا گیا تھا کہ ان کا شمار سب سے مفلس دیہات میں ہوتا ہے ہم نے جس دیہات کو دیکھا وہ اکثر ہندوؤں کے تھے۔ جب ہم گاؤں میں داخل ہوئے تو بیگم وسیم نے کہا کہ میں جس گھر کو دیکھنا چاہوں خود انتخاب کروں۔ اور میں نے سرے پر ہی ایک چھوٹی سی جھونپڑی کی طرف، جو الگ تھی، اشارہ کیا۔ اس گھر کا مالک دروازے میں کھڑا اور اپنا گھر دکھانے کے لیے بہت خوشی سے آمادہ نظر آیا۔

بیگم وسیم سے جو اس کی باتیں ہوئیں ان کو میں نہ سمجھ سکی۔ لیکن چونکہ وہ ان ہزاروں دیہاتیوں کا، جنہیں میں دیکھ چکی ہوں، نمونہ تھا میں نے اچھی طرح اس کا معائنہ کیا۔

وہ ایک دبلا، کمزور سا، ادھیڑ آدمی تھا۔ اور اس کے مضمحل بدن پر سوائے لنگوٹی کے کچھ نہ تھا۔ جسم کی ہر ہڈی گنی جا سکتی تھی اور گھٹنے اس طرح لڑکھڑاتے تھے گویا جسم کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں ہیں۔ جسم کی طرح چہرہ بھی نہایت مضمحل تھا۔ آنکھیں عجب طرح کی ماند اور بے جان آگے کو نکلی ہوئی تھیں۔ ان کی دیکھن بالکل اجنبی نہ تھی۔ اس میں ایک مفرط جبریت تھی اور میں جانتی ہوں کہ جبری لوگ کس طرح دیکھتے ہیں۔ ان آنکھوں کی کامل مایوسی اس عقیدے کا نتیجہ تھی کہ دائمی مصیبت سے کوئی مفر نہیں ہے۔ اس کی آنکھ کی پتلی باتیں کرتے میں اوپر چڑھتی اور اترتی تھی اور آواز تھکی ہوئی کسی قدر بھاری تھی۔ میں اسے رونی نہیں کہہ سکتی کیونکہ بظاہر وہ اس عمر سے گزر چکا تھا جب لوگ رونے جھینکنے سے کام نکالنا چاہتے ہیں۔ اس کے لہجے اور جسم کی عام صورت سے ایک دائمی اضمحلال، جو غذا کی دائمی کم میسری کا نتیجہ تھا، ظاہر ہوتا تھا۔

دروازے کے اندر ذرا سا صحن اور تین چھوٹے چھوٹے تاریک حجرے تھے۔ صحن میں ایک عورت بیٹھی تھی اور چیتھڑوں سے اپنا بدن ڈھانک رکھا تھا۔ دو لڑکے لنگوٹی باندھے اور اپنے باپ کی لڑکپن کی تصویر تھے۔ یہ تینوں ملکر دوتانبے کی رکابیاں، جس میں ممکن ہے انہوں نے کچھ کھایا ہو، مل مل کر صاف کر رہے تھے۔ میں نے کہا ممکن ہے کچھ کھایا ہو، کیونکہ معلوم ہوتا تھا کہ سارے کنبے کو سال ہا سال سے ایسی چیز جسے پورا کھانا کہا جا سکے، میسر نہ ہوئی تھی۔ تن بہ تقدیر اور بالکل بے حس ہونے کی کیفیت سر سے پاؤں تک نمایاں تھی جسے دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ اب وہ اشتہا محسوس کرنے کی قوت کھو چکے ہیں۔ مسلسل نیم فاقہ کشی کا لوگوں پر یہی اثر ہوتا ہے۔ وہ ان کی ساری زندگی کا ست نکال لیتی ہے اور ان کے حواس اور تاثرات کو کند کر دیتی ہے۔

خاندان کی ملک بجز ان دوتانبے کی رکابیوں کے کچھ نہ تھا۔ میں حجروں کے اندر گئی۔ انہیں ایک قسم کے حجرے ہی کہہ سکتے ہیں۔ ان میں کوئی کھڑکی، پکا فرش اور استعمال کی کوئی چیز یا بچھونا

تک نہ تھا۔ زمین پر تھوڑی سی پیال پڑی تھی جس سے بستر کا کام لیتے تھے۔ ان لنگوٹوں اور ان چیتھڑوں کے سوائے، جو اس عورت کے بدن پر تھے، گھر والوں کے پاس اور کوئی کپڑا نہ تھا۔ ہم باہر چلے آئے۔

بعض بعض ایسے موقعے آئے جب میں یہ سوچتی تھی کہ روح یا کوئی شے، جو انسانی جسم نہیں ہے، اس پر گفتگو کرنا فضول ہے۔ یہ موقعے ہمیشہ اس وقت آئے جبکہ میں انتہائی مادی مصائب سے دوچار ہوئی۔ اس موقع پر یہ احساس کامل طور پر ہوا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ گھر والے کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ ہمارے ساتھ اخلاق سے پیش آیا، ہمیں گھر دکھایا اور دوستانہ سلوک بھی کیا جبکہ منہ سے بات نکالنے میں غریب کو انتہائی کوشش کرنی پڑتی تھی؟ میں نہیں سمجھتی کہ کوئی شخص شکم سیر کھانا کھانے کے بعد اس مکان میں آئے تو ایک عجیب قسم کا انفعال محسوس کئے بغیر رہ سکے گا اور یہ انفعال آج تک کوئی اچھا کھانا کھاتے یا اس کا مزہ لیتے وقت میں محسوس کرتی ہوں۔

ہم آگے بڑھے تو گاؤں کے گدلے جوہڑ کے گرد کچھ بچے تھے۔ سب برہنہ، پیٹ پھولے ہوئے اور کسی قسم کی جلدی بیماری میں مبتلا۔ وہ مریل چال سے ادھر ادھر چلتے تھے اور ان کی ٹانگیں ربڑ کے خالی نلکوں کی طرح لڑکھڑاتی تھیں اور ان کی کمریں ابھی سے خمیدہ ہوگئی تھیں۔ نووارد وں کو دیکھ کر انہوں نے کوئی توجہ نہ کی، لیکن وہ منظر جس نے میرے قدم پکڑ لیے ایک چھوٹا سا بچہ تھا جو زمین پر بیٹھا تھا۔ اس کا پیٹ سارے جسم سے قریب قریب دوگنا ہوگا اور خود جسم محض ہڈیوں کی مالا تھا۔ اس نے مٹی میں اپنے پاؤں پھیلا رکھے تھے اور آسمان کی طرف تک رہا تھا۔ ان آنکھوں میں میں نے عجیب دلکشی پائی۔ ان میں اپنے ماحول سے تعلق کی کوئی جھلک نہیں تھی بلکہ ایسے متنفس کی دیکھن تھی جو زندگی ختم کر چکا ہو اور جانتا ہو کہ چند انفاس کا مہمان ہے حالانکہ وہ محض شیر خوار بچہ تھا اور ابھی زندگی کے دروازے میں داخل ہوا تھا۔ میں نہیں سمجھتی کہ اس بچے میں رونے کی

قوت ہوگی خواہ اسے کسی قدر تکلیف پہنچا دی جائے۔ رہی ہنسی.....خیر، جس بستی میں وہ رہتا تھا وہاں اس قسم کی تو کوئی آواز تک نہ سنی گئی ہوگی۔

گاؤں میں دوسرے مکان بھی تھے، اس پہلے سے کسی قدر بہتر، یعنی یہ کہ ان میں ایسی چیز جو بچھونا معلوم ہوتی تھی اور کچھ پھٹے پرانے کپڑے اور چند مسی رکابیاں نظر آتی تھیں۔ سب سے مرفہ الحال گھر وہ نظر آیا جس کے عقب میں صحن اور ایک آدھے چھت کی عمارت تھی۔ دیواروں پر سفیدی کی ہوئی تصویر تھی۔ میں اس کو دیکھ رہی تھی کہ ایک عورت نے چیخ ماری اور اپنے ہاتھ پھیلا کے اسے میری نظروں سے اوجھل کرلیا۔ بیگم وسیم نے بتایا کہ یہ تصویر ان کا دیوتا تھا اور اس عورت کو یہ دیکھ کر کہ ایک مسلمان ملیچھ کی اس پر نظر پڑ رہی ہے، سخت صدمہ ہوا۔

اس گاؤں میں نوع انسان کی نسبت میرے دل میں بہت ناگوار خیالات پیدا ہوئے اور نہایت افسوس ہوا اور شرم آئی کہ میں اس نوع کی فرد ہوں۔ یہ نظارے دیکھ کر ان انسانوں سے کوئی محبت اور ہمدردی باقی نہیں رہتی جو اس قسم کے مصائب جائز رکھتے ہیں۔ اور اس نظارے نے میری گرمجوشی کو مدت تک کے لیے ایسا ٹھنڈا کر دیا کہ میں ہزار ہندوستان کے لطف و مدارات کو اور اس بے نظیر حسن کو جو میں نے یہاں دیکھا، یاد کرتی تھی مگر اس پر بھی جوہڑ کے کنارے خالی آسمان کو تکنے والے اس بچے کی یاد کسی طرح اپنے حافظے سے محو نہ کر سکتی تھی۔

فرض کریں کہ ہندوستان کی آبادی کا اکثر حصہ اسی قسم کی زندگی بسر کرتا ہے.....تو کیا ایسی حالت میں فرقہ پرستی، قوم پرستی یا اور کسی پرستی کی باتیں کرنا مسخرہ پن نہ ہوگا۔ اور یہ عجیب اتفاق تھا کہ ہندوستان کے سب سے زیادہ قابل توجہ مسئلے سے مجھے لکھنؤ کے خوبصورت شہر میں آگہی حاصل ہوئی۔ اس مسئلے کی اب شکل ہی بدل گئی۔ جو کچھ کتابوں میں پڑھا یا زبانی سنا تھا یہ اس سے

بالکل ہی مختلف نظر آنے لگا۔ اب معلوم ہوا کہ اس پینتیس کروڑ انسانوں کی آبادی میں نوے فی صد آبادی یہ تھی جس کے افراد کم وبیش اسی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔'' حوالہ ختم اس زمانے میں عالمی جی ڈی پی کے مقابلے میں پیداوار گھٹ کر 2.4 رہ گئی تھی۔ (4:4)

راقم نے خود ۴۷ء سے ذرا پہلے چار کہاروں کی ڈولی پر سوار حاذق حکیم صاحب کو تین چار کوس سفر کرتے دیکھا تھا۔ اور موصوف مریض کو دیکھنے سے پہلے انہیں اجرت میں فی کس مٹھی بھر بھنے چنے اور گڑ کی ایک ایک ڈلی دلواتے تھے۔

(59) اس طرح پنڈت/ ملا کے دن پھر گئے اور اس بھک مری کے طفیل لنگر خانوں عبادت خانوں دھرم شالوں، مندروں کی صورت میں عبادت خانوں کو عروج ملتا گیا۔ اکبر نے ۱۵۷۵ء میں مذاہب کے درمیان مکالمے اور عقل وفکر کے فروغ کے لیے فتح پور سکیری میں جو ''عبادت خانہ'' قائم کیا تھا وہ ماضی کا قصہ بن گیا۔ اوسط عمر کے بڑھ جانے کے باوجود اکثریت آج کی دنیا ٹھیک کرنے کے بجائے عاقبت سنوارنے پر کمر بستہ ہے۔ کیا کہیں ایسے اعداد وشمار دستیاب ہیں کہ جس طرح پاکستان میں ہر پندرہ سو افراد پر ایک ڈاکٹر ہے برصغیر میں مسجد، مندر گردوارے، گرجا اور اس قسم کی عبادت گاہوں کو اگر پوری ایک سو تیس کروڑ کی آبادی پر تقسیم کر دیا جائے تو معلوم ہو سکے کہ ہر سو افراد پر کتنی عبادت گاہیں ہیں اور یہ اوسط غالباً دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہوگی۔ یہ سب ان قحطوں ہی کا کیا دھرا ہے کہ ہماری اکثریت زندگی پر موت کو ترجیح دیتی ہے۔ اسی عفریت کی تباہ کاریوں کو دیکھتے ہوئے نہرو نے ۱۹۵۵ء کے یوم آزادی پر لال قلعے سے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ملک کے لیے اس سے زیادہ ذلت کی کوئی بات نہیں کہ وہ اناج درآمد کرے۔ اس لیے ہر دیگر شے انتظار کر سکتی ہے لیکن زراعت نہیں کر سکتی (ڈان 14/5/5)

حوالے کے لیے How Corporations Profit from Hunger By

Devinder Sharma دیکھیے

ہندوستان پر اس کا اثر مندرجہ بالا تقریر سے ہو سکتا ہے مگر دو سو سال کی غلامی کی ذلت کے علاوہ برصغیر کے لاشعور پر کیا اثرات مرتب ہوئے اس کے نتائج بھی ملاحظہ کیجیے۔

(۱) نوم چومسکی نے لاہور میں (اکتوبر 2001 میں) تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اس کے خیال میں پاکستان اور بھارت کی حکومتیں گلا گھونٹنے والی یا (Highly Repressive) ہیں۔ انہیں کیسے روادار یا (Permissive) بنایا جائے۔ پاکستانی

سیاسی حالات پر تبصرہ کرنا تو سورج کو چراغ دکھانا ہے ہاں بھارت کے مشہور قانون دان نینی اے پالکھی والا کا کہنا ہے۔ Democracy & Freedom are not synonymous. Adult Franchise may give you the right to choose your tyrants (We the nation)

(2) جمہوریت اور حقیقی آزادی ہم معنی اصطلاحات نہیں ہیں۔ بالغ رائے دہی کا حق بھارتیوں کو محض اپنے لیے جابر حکمراں چننے کا حق دیتا ہے۔

(60) اس گورکھ دھندے یا طلسم کو ختم کرنے کی کوششیں ڈپٹی نذیر احمد نے جسم کے باقی ماندہ ۹۷٪ فیصد حصے کے متعلق اپنی کتاب ''امہات الامہ'' لکھ کر کی جسے پہلی عالمی جنگ کے زمانے میں عصری مقتدرہ نے علماء کے اکسانے پر مذکورہ کتاب کا ڈھیر لگا کر دلی کے کسی چوک میں مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا اور دوسری مرتبہ ۱۹۳۵ء میں اس کی دوسری طباعت پر اس کتاب کا وہی انجام ہوا۔ اس کے علاوہ عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو نے مقدور بھر کوشش کیں اور نقاب پوش وہی وہانوی نے بھی۔ وقت کی ہندوستانی اور پاکستانی مقتدرہ نے دونوں کو کس طرح ہراساں کیا اور ستایا اس سے آپ لوگ بخوبی واقف ہیں۔ ہمارے سامنے

فرحت عباس شاہ کی شاعری بھی موجود ہے جس کے ۲۰۰۰ء تک پچاس ہزار نسخے فروخت ہو چکے ہیں۔

(61) آخر میں ارتقا کے ۳۴ویں شمارے کے مقالے ''زبان کے زخم'' میں معروف ادیبہ نے اپنے موضوع سے خوب انصاف کیا ہے اور دلائل سے عورت کی مظلومی بیان کی ہے۔ اسکے باوجود ہمیں مرد اور عورت کو ایک اکائی سمجھ کر از سر نو جائزہ لینا ہوگا اور ہمیں دونوں صنفوں کی سرگرمیوں کے اسباب کا سراغ لگانا چاہیے۔

یہ بات خلیے یا جینوم کی سائنس نے بھی ثابت کر دی ہے کہ تمام انسان ۹۸.۸٪ تک بالکل یکساں ہیں۔ اپنی بات ختم کرنے سے پہلے میں چند سوالات اٹھانا چاہتا ہوں۔ بقول Arnold J. Toynbee اپنی کتاب "Change & Habit" میں کہتا ہے The most Intimate Human Relation is mating جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے ''انسان کا سب سے زیادہ بے تکلف رشتہ مجامعت ہے''۔ یہاں زیادہ تر سنجیدہ اور بالغ نظر لوگ بیٹھے ہوئے ہیں جنہیں زندگی کا طویل تجربہ ہے۔ خواتین و حضرات آپ میری تعلیم فرمائیں کہ جنس پر آمادہ کرنے کے لیے زن و شوہر کون سے جملے استعمال کرتے ہیں اگرچہ مغرب میں ان دنوں یہ غور ہو رہا ہے کہ تعلقات ختم کرنے کے لیے رخصت ہوتے وقت کن الفاظ سے کام لیا جائے۔ شمس الرحمان فاروقی نے (لفات روزمرہ صفحہ ۳۷) پر طلسم ہوشربا کے حوالے سے بتایا ہے کہ عورتیں کہتی ہیں ہم نے رات میں بات کر لی ہے کیا برصغیر بھر میں یہی محاورہ رائج ہے اور ان مواقع پر مرد کیا کہتے ہیں؟

میں اپنی معروضات ورلڈ سوشل فورم کے نعرے پر ختم کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ جو خوشحالی انصاف اور مساوات کے لیے جدوجہد کر رہا ہے یعنی ''ایک دوسری دنیا بھی ممکن ہے''

شکریہ ۷/۷/۲۰۰۵

Send send your comments to **Dr. Khalid Sohail**